جلد ۱۷ عدد ۸

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

اگست ۱۹۷۰ء

اس شمارے میں ایک اہم مضمون

اسلام اور پاکستان

از قلم۔ڈاکٹر اسرار احمد

زیر سرپرستی
مولانا امین احسن اصلاحی

صدر اعزازی
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

★

مدیر مسؤل

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم۔بی۔بی۔ایس (پنجاب) ایم۔اے اسلامیات (کراچی)

یکے از مطبوعات

دارالاشاعۃ الاسلامیہ لاہور

کوثر روڈ۔اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور - ۱ (فون 69522)
قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۱

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام

از قلم : ـــــــ اسرار احمد

+ فکر مغرب کا ہمہ گیر استیلاء + بنیادی نقطہ نظر + عالم اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش + مدافعت کی اولین کوششیں اور ان کا ماحصل + علوم عمرانی کا ارتقاء + اسلامی نظام حیات کا تصور اور بیسوی صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں + کرنے کا اصل کام + احیائے اسلام کی شرط لازم : تجدید ایمان + تعمیر کی کوتاہی + عملی اقدامات

مع تائید و توثیق بعنوان

”فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر“

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

”دونوں مقالے ماہ نامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے ۔ دونوں فکر انگیز ہیں ۔ اور ایک طرف جوش و اخلاص ، دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں ۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج ، دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے ۔ تشخیص اور علاج اناڑیوں اور عطائیوں کا سا نہیں ۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے ۔ “

مولانا عبدالماجد دریا بادی

صدق جدید ـ ۷ فروری ۱۹۶۹ء

سائز ۸/۲۲ × ۱۸ صفحات ۵۶ ـ طباعت آفسٹ ، قیمت ایک روپیہ

ـ: شائع کردہ :ـ

دار الاشاعۃ الاسلامیہ لاہور

کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ـ ۱ (فون 69522)

دعوتِ توثیقِ عہدِ الست و تجدیدِ میثاقِ ایمان کا علمبردار

ماہنامہ

میثاق

لاہور

• جلد ۱۷ —— • شمارہ ۸

بابت

اگست ۱۹۷۰ء

★ فی پرچہ —— ایک روپیہ

★ سالانہ —— دس روپے

شرائط ایجنسی

ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے

پرچہ صرف بذریعہ وی پی ارسال ہوگا

کمیشن ۲۵ فی صد —— محصولڈاک بذمہ "میثاق"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

دارالاشاعتِ الاسلامیہ

کوثر روڈ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۱۔ فون ۶۹۵۲۲

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ ـــــــــــ اسرار احمدؒ ۳
* اسلام اور پاکستان ـــــــــــ اسرار احمدؒ ۹
● تحریک پاکستان کا تاریخی پس منظر اور اس میں قومی و مذہبی عوامل کا تناسب ۱۱
● قیام پاکستان کے بعد مذہبی طبقات کا طرزِ عمل ہونا کیا چاہیے تھا، ہوا کیا! ۲۲
● سیاسی افراتفری سے ایوبی آمریت تک جماعت اسلامی کا، قیبانہ کردار اور علماء کی معاندانہ روش ۳۰
● چند تلخ مگر سنگین حقائق ۳۶
* غزل ـــــــــــ پروفیسر مرزا محمد منورؔ
● "کہ رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شدُ!" ۴۱
* افادات فراہی رحؒ ـــــــــــ
● دین کا نظام (ترجمہ) خالد مسعود ۴۳
* تدبر قرآن ـــــــــــ مولانا امین احسن اصلاحی
● تفسیر سورۂ اعراف (۷) ۴۹
* تقریظ و تنقید ـــــــــــ ادارہ
● "صحابہ کرامؓ اور اُن پر تنقید" تالیف مولانا محمد عبداللہ ۷۱
* تاریخ تصوف اسلامی ـــــــــــ پروفیسر یوسف سلیم چشتی
● ابونصر سراج صاحب کتاب اللمع ۷۳
* خطوط و نکات ـــــــــــ
● مکتوب گرامی مولانا محمدؒ منظور نعمانی مدیر "الفرقان" لکھنؤ ۸۰

اسرار احمدؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

پاکستان کی موجودہ حکومت کا یہ کارنامہ بلاشبہ نہایت قابل داد ہے کہ اس نے ڈیڑھ سال سے بھی کم مدت میں ملک کو سخت ہیجان انگیز اور ہنگامہ خیز ' انقلابی ' فضا سے نکال کر نہایت پرسکون ' سیاسی ' جدّ و جہد کی راہ پر ڈال دیا ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کے طول و عرض میں ' انتخابی ' سرگرمی جس زور شور کے ساتھ لیکن جس ہموار طریقے پر جاری ہے اس کے پیش نظر یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ صرف سال سوا سال قبل یہاں " گھیراؤ " اور " جلاؤ " کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور مظاہروں، جلوسوں اور ہڑتالوں سے شہری زندگی تقریباً معطل ہو گئی تھی ——— اور نہ صرف باہمی تصادم اور سر پھٹول بلکہ باقاعدہ کشت و خون اور بسوں وار کا خطرہ درپیش تھا!

صدر یحییٰ نے اپنی ۲۸ جولائی کی نشری تقریر میں اگر اس سلسلے میں کسی کریڈٹ کا دعویٰ کیا ہے تو یہ یقیناً ان کا حق ہے ——— جس قسم کے ناگفتہ بہ اور مخدوش حالات میں انہوں نے حکومت کی ذمہ داری سنبھالی تھی ان کا بیان تحصیل حاصل ہے، الجھی ہوئی صورتِ حال کی یہ گتھی کسی نہایت پختہ کار، معاملہ فہم اور سلجھے ہوئے سیاست دان کے ناخنِ تدبیر ہی سے سلجھ سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس قسم کے حالات میں ذرا سی بے احتیاطی نہایت مضر نتائج پیدا کر سکتی ہے اور جہاں ضرورت سے زیادہ نرمی سے لوگوں کی جرأتیں بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں ضرورت سے زیادہ سختی بھی جلتی پر تیل کا کام کر سکتی ہے ——— گویا کہ " سردی گرمی، نرمی سختی " کا ایک نہایت معتدل سا امتزاج ہی ایسے مواقع پر کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ماننا پڑتا ہے کہ صدر یحییٰ اس " بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز " راستے پر چلنے میں کامیاب رہے ——— ابتدا میں انہوں نے قدرے نرمی سے کام لیا جیسے، جیسا کہ خود انہوں نے فرمایا، کچھ لوگوں نے کمزوری پر محمول کیا، لیکن انجام کار ان کی یہ پالیسی صحیح ثابت ہوئی اور اس طرح واقعتہً لوگوں کے دلوں کی بھڑاس نکل گئی۔ چنانچہ بعد میں انہوں نے تدریج کے ساتھ باگیں کھینچنی شروع

کر دیں تاآنکہ آج اُدھر مولانا بھاشانی کے صاحبزادے 'اندر' ہیں اور مسیح الرحمان صاحب بھی معافی مانگ کر ہی 'باہر' آسکے ہیں، اور اِدھر مسٹر بھٹو کی شوخیاں قصہ ماضی بن چکی ہیں اور اب وہ ہر بات ناپ تول کر کر رہے ہیں ——— اور صورت یہ ہے کہ انتخابی جلسے اطمینان اور سکون کے ساتھ ہو رہے ہیں اور کہیں گڑبڑ نہیں ہو پاتی اور بڑے بڑے جلوس نکل رہے ہیں لیکن ہنگامہ نہیں ہوتا اور بڑے بڑے جغادری قسم کے 'انقلابی' رہنما بھی ووٹوں اور سیٹوں کے "اہتمامِ تشنگ دنز" کے شدید "دردِ سر" میں مبتلا کاسۂ گدائی لئے مارے مارے پھر رہے ہیں۔

اِن حالات میں صدر یحییٰ کا تازہ انتباہ بہت بروقت بھی ہے اور نہایت معنیٰ خیز بھی۔ اس لئے کہ اب حالات جس مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اس میں تھوڑی سی نرمی سے بھی سارے کئے کرائے پر پانی پھر سکتا ہے اور اب نہ صرف یہ کہ اگر حکومت امن و سکون کے قیام اور نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لئے سختی کرے تو وہ بالکل حق بجانب ہوگی بلکہ اگر صورت اس کے برعکس ہو اور حکومت کی نرمی کی وجہ سے صورتِ حال دوبارہ بگڑ جائے تو خود حکومت پر یہ الزام آئے گا کہ وہ اقتدار کی منتقلی کو معرضِ التوا میں رکھنا چاہتی ہے۔

اور یہ وہ الزام ہے جس سے موجودہ حکومت کم از کم تاحال بالکل بری ہے ——— اس لئے کہ اگرچہ نیتوں اور ارادوں کا جاننے والا تو اللہ ہی ہے تاہم اس وقت تک صدر یحییٰ اور ان کی حکومت کے بارے میں کسی انتہائی بدگمان مزاج انسان کے لئے بھی یہ کہنا کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اقتدار کو عوام کے منتخب نمائندوں کی طرف منتقل کرنے کے معاملے میں نیک نیت نہیں ہیں۔ انہوں نے اس معاملے میں جس پختہ عزم کے ساتھ مسلسل اور بروقت اقدامات کئے ہیں اس سے تاحال ان کی پوزیشن شک و شبہ سے بالکل بالا رہی ہے۔ اور اب اسی پوزیشن کا تقاضا ہے کہ ایک طرف تو وہ انتخابات کے لئے سازگار فضا برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور اس معاملے میں کسی نرمی کو ہرگز راہ نہ دیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو انتخابات سے بالکل قریب ملک پر نیم فوجی و نیم سول حکومت کی بجائے خالص فوجی نظم قائم کر دیں[1] ——— اور دوسری طرف انتخابات کے التوا کے کسی مطالبے پر کان نہ دھریں بلکہ ووٹروں کو ہر امکانی سہولت مہیا کرنے پر خواہ کتنا ہی خرچ آجائے انتخابات مقررہ تاریخ پر ضرور منعقد کرائیں۔ تاکہ اس شبہ کی گنجائش پیدا نہ ہو سکے کہ موجودہ حکومت خود زیادہ دیر تک برسرِ اقتدار رہنا چاہتی ہے!

[1] اس سلسلے میں ہمارے نزدیک یہ مطالبہ بھی بالکل صحیح ہے کہ انتخابات سے دو ماہ قبل کم از کم صدارتی کابینہ کو تو سبکدوش کر ہی دیا جائے۔

اس موخر الذکر معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم ایک غریب قوم ہیں اور انتخابی بخار کی جس کیفیت میں ہم اس وقت من حیث القوم مبتلا ہیں اس کو طول دینے کی 'عیاشی' کے ہم کسی طرح متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس وقت نہ صرف یہ کہ پوری قوم کی توجہ انتخابات پر مرتکز ہو گئی ہے بلکہ ایک غریب قوم کے روپے پیسے کی حقیر پونجی اور صلاحیتوں، قوتوں اور اوقات کے سرمائے کا بڑا حصہ اس مد میں صرف ہو رہا ہے۔ چنانچہ اب یہ مرحلہ جس قدر جلد طے ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے اور اس کو طول دینا کسی طرح صحیح نہیں، اس لئے کہ :

ع اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا !"

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ " اقتدار کی منتقلی " کی ذمہ داری کا بوجھ جتنا جتنا موجودہ حکومت کے کندھوں سے اترتا جا رہا ہے اتنا ہی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے کندھوں پر پڑتا چلا جا رہا ہے ——— اور جس قدر وہ بری الذمہ ہوتی جا رہی ہے اسی قدر یہ 'ذمہ دار' بنتے چلے جا رہے ہیں ——— تا آنکہ اگر انتخابات بروقت منعقد ہو گئے اور بہ ظاہر احوال اب یہ یقینی ہی سا نظر آتا ہے اور پھر بھی اس ملک کے پیچیدہ مسائل حل نہ ہوئے اور معاملات کی گتھی نہ سلجھی تو مستقبل کا مؤرخ مجبور ہو گا کہ اس کی ذمہ داری سے موجودہ فوجی حکومت کو بالکل بری قرار دے اور سارا الزام سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں پر عاید کرے ——— گویا آئندہ چند ماہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کے فہم و فراست، تدبّر و حکمت، قربانی و ایثار اور سب سے بڑھ کر حبِّ وطن اور حبِّ قوم کے لئے کھلا چیلنج بن کر آ رہے ہیں اور بزبان حال مبارزت خواہ ہیں کہ :۔

ع "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے !"

پاکستانی سیاست کا جو دور اواخر ۱۹۶۸ء سے شروع ہوا تھا اس میں اوّل اوّل انقلابیت کا دور دورہ رہا اور اس کی ایسی طوفانی آندھی آئی کہ باقی ہر چیز نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ اس کا زور کم ہوا اور فضا قدرے صاف ہوئی تو اسلام اور سوشلزم کی کاغذی اور ہوائی جنگ شروع ہو گئی اور کچھ عرصے کے لئے تو ایسا سماں بندھا کہ گویا ایک طرف "نظریہ پاکستان" ہے جو خالص اور بے میل اسلام ہے اور دوسری طرف سوشلزم ہے جو بے شک و بلاریب کفر ہے ——— اور جنگ بس صرف ان دو کے مابین ہے، بیچ کی راہ سرے سے کوئی ہے ہی نہیں ! ——— ادھر کچھ عرصے سے یہ مصنوعی شورا شوری

بھی ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہوائی باتوں کے بجائے ٹھوس معاملات پر گفتگو ہونے لگی ہے اور 'روما نویت' پر حقیقت پسندی غالب آنے لگی ہے۔ نتیجتہً ایک طرف دولتانہ اور فضل القادر گلے مل گئے ہیں اور بھٹو اور قاضی فضل اللہ میں بھی 'معاملے' کی بات چیت ہوتی ہے چاہے بیل منڈھے نہ چڑھ سکی ہو ـــــ اور دوسری طرف 'انتہا پسندی' کی مذمت ہونے لگی ہے اور باقاعدہ پرچار شروع ہو گیا ہے کہ ملک و ملت کی نجات "بیچ کی راہ" اختیار کرنے میں ہے۔

اس سلسلے میں بعض نہایت 'عریاں حقائق' بھی بہت دلچسپ انداز میں پیش کئے جانے لگے ہیں مثلاً یہ کہ :-

" پاکستان 'غیر صالح' لوگوں ہی نے قائم کیا تھا اور وہی اسے قائم رکھ سکتے ہیں ...."

یا یہ کہ : " تحریکِ پاکستان صرف 'لبرل اسلام' کی علمبردار تھی نہ کہ رجعت پسند مولویانہ اسلام کی .....!" وغیرہ وغیرہ

ان باتوں پر اس اعتبار سے تو اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ 'عریاں نگاری' ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ 'حقیقت نگاری' نہیں۔ سچ ہے :

" نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا !"

ادھر ہمارے 'فقیہائے مصلحت بیں' اور 'حکمائے حکمت عملی' کا حال یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے پورے ماضی سے دستبردار اور سابقہ ہر موقف سے منحرف ہو گئے ہیں بلکہ اپنی ساری ذہانت اس پر صرف کر رہے ہیں کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر اور تاریخ کو مسخ کر کے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دکھایا جائے۔ چنانچہ "جماعت اسلامی نے کبھی تحریک پاکستان کی مخالفت نہیں کی !" ایسے دروغ مصلحت آمیز کا سلسلہ تو عرصہ دراز سے چل ہی رہا تھا۔ اب ایک قدم آگے بڑھا کر قیام پاکستان کے کریڈٹ میں بھی حصہ داری کا دعویٰ شروع ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں جماعت کی سول سروس کے اساتین ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک نسبتہً سادہ لوح بزرگ تو کچھ عرصہ قبل ایک جلسہ عام میں یہ تک کہہ بیٹھے کہ :-

"پاکستان کے قیام میں اکیلے مولانا مودودی کا حصہ باقی تمام لوگوں کے مجموعی حصے سے بھی زیادہ ہے ....!"

——جس پر پرائے تو خیر پرائے ہی ہوتے ہیں اپنوں[1] کو بھی چیخ اٹھنا پڑا کہ :-

ع "اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ!"

ہمارا اسی وقت یہ خیال تھا کہ یہ بات ان کی 'طبع زاد' نہیں ہو سکتی بلکہ معاملہ لازماً "اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" کا ہے اور یقیناً یہ 'نکتۂ نادرہ' کسی سہ پہر کی مجلس میں ملاءِ اعلیٰ کی جانب سے القا ہوا ہے —— چنانچہ حال ہی میں بات واضح ہو گئی اور مودودی صاحب نے بہ نفس نفیس بعض نکات نادرہ ارشاد فرما کر اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے! —— چنانچہ ایک طرف یہ ارشاد فرما کر کہ : "جماعت اسلامی ہندوستان کی مسلمان قوم کے دفاع کے حصارِ ثانوی کے طور پر قائم کی گئی تھی!" —— قطع نظر اس سے کہ یہ صحیح ہے یا غلط اور سچ ہے یا جھوٹ، کم از کم اپنی طرف سے تو نہ صرف یہ کہ اپنی "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" اور "مسئلہ قومیت" ایسی تالیفات سے اعلان برأت کر دیا بلکہ مسلمانانِ ہند کی قومی جد و جہد سے علیحدہ ہو کر بین الاقوامی سطح پر "ایک خالص اصولی اسلامی دعوت" کے اجراء کی جو غلطی سرزد ہو گئی تھی اس پر 'قومی عدالت' میں معافی نامہ بھی داخل کر دیا —— اور دوسری[2] طرف یہ اعلان کر کے کہ : "ہم نہ مردوں کو داڑھی رکھنے پر مجبور کریں گے نہ عورتوں کو برقع پہننے پر!" نہ صرف یہ کہ اپنی مایۂ افتخار تصنیف 'پردہ' سے رجوع کر لیا بلکہ اپنی مبینہ 'راسخ العقیدگی' سے تائب ہو کر 'لبرل اسلام' کی بارگاہ میں سجدہ سہو بھی ادا کر دیا ؎

"دیکھ کعبے میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ!"

رہا یہ سوال کہ آیا اس تمام ہیر پھیر سے کچھ حاصل بھی ہو سکے گا یا نہیں؟ —— تو ظاہر ہے کہ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے وہ تو بہرحال اتنی بڑی بڑی قیمتیں کسی بڑی توقع ہی پر ادا کر رہی ہے —— اور یقیناً کوئی بڑی ہی امید[3] ہے جس کی بنا پر اپنے پورے دین و مذہب کو "اک قصۂ ماضی" بنا یا

---

[1] چنانچہ ہفت روزہ "زندگی" لاہور نے اس موضوع پر ایک باقاعدہ مقالہ افتتاحیہ شائع کیا۔

[2] اس فریب خوردگی پر بھی 'اسلام پسند' حلقے کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہفت روزہ جریدے "زندگی" نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں تحریر کیا ہے کہ : "..... لیکن گذشتہ کچھ عرصے سے انتخابی مہم کے دوران جماعت کے مختلف اکابرین نے جس طرح کے مبالغہ آمیز (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جارہا ہے ——— لیکن ہمیں یقین ہے کہ قوم کے بارے میں یہ گمان کہ شاید یہ بھی ع "ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!"[1] والا معاملہ کرلے گی بڑی خوش فہمی ہے ——— یہ دنیا بڑی 'حقیقت پسند' واقع ہوئی ہے اور ایسی سطحی باتوں سے یہاں کوئی دھوکا نہیں کھاتا ——— خصوصاً جو خود اپنے 'ماضی' ہی سے رشتہ توڑ لیں ان سے کون اپنا 'حال' وابستہ کرنا پسند کرتا ہے۔ ان کا انجام تو یہی ہوتا ہے کہ جیسا کہ کبھی ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا، یہ بے لنگر کی کشتیوں کے مانند لہروں کے رحم وکرم پر ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے رہیں اور ؎

"ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!"

کی جیتی جاگتی تصویر ——— اور خلق خدا کے لئے عبرت کا سامان بن جائیں!

اس شمارے میں ہم بھی اپنی "حقیقت نگاری" کی ایک کوشش کو، جو ہم نے مسلسل مارچ تا مئی ۱۹۶۷ء کے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں کی تھی دوبارہ قارئین 'میثاق' کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، حالات کے بہت بدل جانے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ان مضامین کی کچھ باتیں پرانی معلوم ہوں لیکن پھر بھی ہمارے نزدیک ع "گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را!" کی اپنی جگہ ایک افادیت ہے اور حال کے بہت سے مسائل و معاملات کی اصل حقیقت ماضی کو پیش نظر رکھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے ——— اور پھر حقیقت بہرحال حقیقت ہے چاہے کتنی ہی کڑوی اور کیسی ہی ناخوشگوار معلوم ہو ——— !!

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دعوے شروع کئے ہیں ان سے ہر صاحب نظر کو صدمہ پہنچا ہے اس کے رہنماؤں کی طرف سے کبھی تو عوام کو مژدہ سنایا جاتا ہے کہ بلوچستان میں ہماری حکومت قائم ہو جائے گی اور کبھی یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ فلاں علاقے پر ہم قبضہ کرلیں گے ——— ہمیں حیرت ہے کہ ایک ایسی سیاسی جماعت جس کی بنیادی حیثیت دینی ہو، اس کے ذمہ دار ارکان اس قدر غیر ذمہ دارانہ انداز لگا کر خود کو خوش فہمیوں میں مبتلا کرکے اور عوام کو اپنی کامیابیوں کی لوریاں سنا کر آخر کون سی شے حاصل کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں ....."

[1] "میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو!" ہنس کے وہ بولی کہ "پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!" اکبر

ع

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

★

اسلام

اور

پاکستان

کچھ ناخوشگوار واقعات
اور تلخ حقائق

(میثاق، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۶۷ء کے اداریے)

از قلم: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

★

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝

(یہ تو بس ایک یاد دہانی ہے!)

(۱)

تحریکِ پاکستان کا تاریخی پس منظر

اور اس میں

قومی و مذہبی عوامل کا تناسب

(تذکرہ و تبصرہ "میثاق" مارچ ۱۹۶۷ء)

(۲)

قیامِ پاکستان کے بعد مذہبی طبقات کا طرزِ عمل

ہونا کیا چاہیئے تھا، ہوا کیا!

(تذکرہ و تبصرہ "میثاق" اپریل ۱۹۶۷ء)

(۳)

سیاسی افراتفری سے ایوبی آمریت تک

جماعت اسلامی کا رقیبانہ کردار

اور علماء کا معاندانہ رویّہ

(تذکرہ و تبصرہ "میثاق" مئی ۱۹۶۷ء)

(۴)

کچھ تلخ مگر سنگین حقائق

(ایضاً)

تحریکِ پاکستان کا تاریخی پسِ منظر

اور اس میں

قومی و مذہبی عوامل کا تناسب

اگر کوئی یہ کہے کہ ــــ "پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا" ــــ تو پورے ملک میں شاید کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکل سکے جو اس کی تردید کرے! ــــ لیکن اگر سوال یہ ہو کہ ــــ "تحریک پاکستان کا اصل محرک مذہبی و دینی تھا ــــ یا معاشی و معاشرتی ــــ تو اس کے جواب میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے!

حال ہی میں لاہور کے ایک انگریزی روزنامے[1] کے کالموں میں پاکستان کے ایک مشہور و معروف کالم نویس[2] نے اس بحث کو چھیڑا ہے اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ:

"تحریک پاکستان ہرگز ایک مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ دراصل اس کے پیکر میں (برصغیر کے مسلمانوں کی) صرف قومی امنگوں کا اظہار ہوا تھا ...."

بہت سے لوگوں کے نزدیک ان کالم نویس صاحب کی بات شاید اس لئے قابلِ توجہ نہ ہو کہ وہ (حکومت کے ملازم) ہیں[3]۔ لیکن جہاں تک اس نظریے کا تعلق ہے یہ صرف ان کا نہیں ہے بلکہ مرحوم حسین شہید سہروردی جو نہ صرف یہ کہ تحریکِ مسلم لیگ کے پرانے کارکن تھے بلکہ جنہیں بجا طور پر پاکستان میں حزبِ اختلاف کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے ــــ اور جو یہاں پارلیمانی جمہوریت کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ بارہا ان سے کہیں زیادہ واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کر چکے ہیں ــــ اور حال ہی میں پاکستان کے ایک دوسرے بزرگ سیاست دان اور تحریک پاکستان کے پرانے کارکن جناب نورالامین

---

[1] پاکستان ٹائمز [2] مسٹر ڈیڈ۔ اے۔ سلہری

[3] واضح رہے کہ یہ تحریر مارچ ۱۹۶۷ء کی ہے۔

نے بھی ایک ماہنامے کے ایڈیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نظریے کی تائید کی ہے ——!

واقعہ یہ ہے کہ سوائے ان عوام الناس کے جنہیں ان معاملات کا شعور ہی نہیں ہوتا یا ان معدودے چند لوگوں کے جو صرف مذہب کے سہارے ملکی سیاست کے میدان میں داخل ہو جانے کی بنا پر تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں —— باقی جو شخص بھی بغیر جانب داری کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرے گا وہ اس نظریے کی صداقت سے انکار کی جرأت نہ کر سکے گا!

اللہ تعالیٰ حکیم اور علیم ہے —— اور اپنی حکمتوں کو وہی بہتر جانتا ہے تاہم بظاہر جو کچھ نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی بھی بدقسمتی تھی اور شاید خود اسلام کی بھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تحریک کو ابتدا ہی سے کچھ ایسے حادثوں سے دو چار ہونا پڑا جن کے نتیجے میں یہ روز بروز مذہب سے دور ہوتی چلی گئی۔

واضح رہے کہ برصغیر میں تحریک استخلاصِ وطن کے اوّلین داعی مسلمان تھے —— تحریکِ شہیدینؒ جہاں احیائے اسلام کی ایک ہمہ گیر تحریک اور منظم کوشش تھی وہاں استخلاص وطن بھی اس کے مقاصد میں ایک اہم حیثیت رکھتا تھا۔ گویا اس میں دین اور سیاست کا وہ حسین امتزاج موجود تھا جو ہماری تاریخ کے قرنِ اوّل کا طرۂ امتیاز ہے۔

حادثہ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے بعد بھی تقریباً ربع صدی تک آزادیٔ وطن کی کوششوں میں اسی تحریکِ شہیدینؒ کے باقیات الصالحات کی جلوہ آرائی نظر آتی ہے اور اسی کے متعلقین و متاثرین کہیں جیلوں میں تشدد اور بہیمیت کے شکار بنتے اور کہیں پھانسی کے تختوں کو زینت بخشتے نظر آتے ہیں۔

اس پورے عرصے میں آزادیٔ وطن کی جد و جہد میں کوئی غیر مسلم نظر نہیں آتا! —— اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ ہندوؤں کے لئے انگریز کی غلامی ایسی نئی اور انوکھی بات نہ تھی اور ان کے لئے معاملہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی کا تھا —— جبکہ مسلمان حال ہی میں مسند حکومت سے اتر کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے تھے لہٰذا یہ بالکل فطری بات تھی کہ آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کی ابتداء بھی انہی کی طرف سے ہوتی!

۱۸۵۷ء کے معرکۂ آزادیٔ وطن میں پہلی بار ہندوستان کے مسلمان اور غیر مسلم سب شانہ بشانہ اور دوش بدوش غیر ملکی استبداد کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ اس جنگِ آزادی کی اس اہم خصوصیت کے علاوہ کہ اس میں ہندو اور مسلمان یکساں شریک ہوئے، اس کی دوسری اور اہم تر خصوصیت یہ تھی کہ اس

ہیں مسلمانوں کے سیاسی و عسکری زعماء کے ساتھ ساتھ ـــــ بلکہ بعض مقامات پر ان سے بھی بڑھ کر دینی و مذہبی پیشواؤں نے حصہ لیا ـــــ اور علمائے کرام نے بھی سیف بدست اور سر بکف ہو کر جان کی بازی لگائی۔

۱۸۵۷ء کے بعد تاریخ ایک بالکل نیا موڑ مڑ گئی! ـــــ اور کمپنی بہادر کی حکومت کے اختتام اور براہ راست تاج برطانیہ کے زیر انصرام آجانے کے بعد ہندوستان میں حالات نے بالکل دوسرا رخ اختیار کر لیا۔

ایک طرف انگریزی استعمار نے اپنے پنجے جسد ہند پر مضبوطی سے گاڑے اور اس کا سیاسی و عسکری تسلط مستحکم ہو گیا ـــ نتیجۃً ہندوستانی روز بروز پستے اور عسکری اعتبار سے بے دست و پا ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ آزادی کے لئے بھی بالکل غیر عسکری و خالص آئینی و سیاسی جد و جہد کا آغاز ہوا۔

اور اس کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی غیر مسلم اقوام کی عددی فوقیت کے نتائج و عواقب کا ظہور شروع ہو گیا ـــــ!

دوسری طرف خود انگریز نے تلوار کے بجائے قلم سے حکومت شروع کی اور ہندوستانیوں کو ان کے اپنے ماضی سے منقطع، اپنے عقائد و افکار و نظریات سے دست بردار اور اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے علوم و فنون سے بیگانہ کر کے ایک نئے ہندوستان کی داغ بیل ڈالنی شروع کی۔ غیر ملکی حکمرانوں کے اس "ثقافتی انقلاب" کا استقبال ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانب سے مختلف طرز پر ہوا۔ ہندو اپنے ماضی سے پہلے ہی بہت دور نکل آئے تھے اور ان کا اپنے علوم و فنون اور اپنے تہذیب و تمدن سے کوئی گہرا رشتہ باقی نہ رہا تھا لہٰذا انہوں نے تقریباً یکسو اور متحد ہو کر نئے رجحانات کو خوش آمدید کہا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو ابھی اپنا شاندار ماضی پوری تابناکی کے ساتھ نظر آ رہا تھا اور ان کے عقائد اور علوم و فنون ابھی ان کے قلوب و اذہان میں گہری جڑیں رکھتے تھے ـــــ لہٰذا ان کے ہاں ایک انتشار پیدا ہو گیا ـــــ مسلمانانِ ہند کے ان طبقوں نے جو دین و مذہب سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے۔ بدلتی ہوئی ہوا کے ساتھ اپنا رخ تبدیل کرنے سے انکار کر دیا اور وہ زندگی کی شاہ راہ سے ہٹ کر گوشوں اور کونوں میں قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسول ﷺ کے درس و تدریس میں منہمک ہو گئے ـــــ جب کہ ہندوستان کی مسلمان قوم کا سوادِ اعظم ـــــ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"! کے نظریے کو اپنا کر نئے حالات کے مطابق بدلتا چلا گیا۔

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی توانائیاں منتشر ہو گئیں اور مجموعی طور پر ہندوستان کی مسلمان قوم کی قوت و طاقت کو ضعف پہنچا اور

دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی طبقے اور قومی قیادت میں بُعد پیدا ہو گیا جو بعد میں مسلسل بڑھتا چلا گیا اور اسے بجا طور پہ دورِ جدید میں اسلامیانِ ہند کی قومی تحریک کی بدقسمتیوں کا سرِ آغاز کہا جا سکتا ہے۔

ساتھ ہی مندرجہ بالا دو اسباب کی بنا پر ——— یعنی ایک[1] اس وجہ سے کہ خالص آئینی جد و جہد میں اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور دوسرے[2] اس بنا پر کہ مسلمانوں سے مذہبی طبقات کے قوم کے سوادِ اعظم سے علیحدہ ہونے کی بنا پر ان کی مجموعی قوت میں کمی پیدا ہو گئی ——— ہندوستان میں غیر مسلموں کا پلڑا بھاری ہونا شروع ہوا۔

اس میں مزید اضافہ غیر ملکی حکومت کی جانب سے غیر مسلموں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کے ساتھ سرد مہری ہی نہیں بلکہ باقاعدہ ہمت شکنی کی کوششوں سے ہوا۔ غیر ملکی حکمرانوں کا یہ رویّہ بھی بلا وجہ نہ تھا۔

اوّلاً انہیں خوب معلوم تھا کہ انہوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی ہے اور اس تازہ زخم خوردہ قوم کی خاکستر میں ابھی ایسی چنگاریاں موجود ہیں جو کسی بھی وقت معمولی سی تحریک سے بھڑک سکتی ہیں۔

ثانیاً ہندو صرف ہندوستان میں تھے جبکہ ہندوستانی مسلمان اس عالمگیر اسلامی برادری کا جزو تھے جو کرۂ ارضی کے ایک بہت بڑے حصے میں ایک غالب اکثریت میں تھی اور ابھی تک اس کے قلوب فاصلوں کے بُعد اور حالات و مسائل کے فرق کے باوجود کچھ ایک ہی سے احساسات و جذبات سے معمور اور ایک ہی سے نشے سے مخمور تھے ——— ! حتیٰ کہ صفحہ ارضی کے بعید ترین گوشوں میں بسنے والے مسلمان ایک دوسرے کی تکالیف و مصائب پہ ایسے تڑپ اٹھتے تھے جیسے خود ان ہی کے سینوں میں خنجر گھونپ دیا گیا ہو ؂

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے مسلمانوں پہ مغربی استعمار اس دور میں جو ستم ڈھا رہا تھا وہ اس کے کرب و الم کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے اور اس کی بنا پر ان کے دلوں میں انگریز دشمنی کے جذبات کو مزید انگیخت مل رہی تھی۔

ہندوستان کا ہندو غیر ملکی حکمرانوں کی نگاہ میں کچھ زیادہ ہی بے ضرر اور مسکین تھا۔ چنانچہ ایک طرف خود اس نے نئے حکمرانوں کے ساتھ توافق و تعاون میں مسلمانوں پہ پیش قدمی کی۔ اور دوسری طرف غیر ملکی

حکمرانوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ ہندوستان کے طول و عرض میں ہندو قوم میں ایک عام بیداری کی لہر دوڑ گئی اور وہ من حیث القوم ایک نئے جذبے، نئی امنگ اور نئی امید کے ساتھ قومی تعمیر نو کے کام میں منہمک ہو گئی ——— ہندوؤں میں اس قومی بیداری کے ساتھ ساتھ مسلمان دشمنی کے پرانے لیکن دبے ہوئے جذبات بھی ایک دم جاگ اٹھے۔

نتیجتہً انگریزی استعمار کے سائے میں ہندو امپیریلزم نے انگڑائیاں لینی شروع کیں۔ اور اس طرح ہندوستان میں ہندو مسلم کشمکش کے دور جدید کا آغاز ہو گیا!

یہ کشمکش ابتدا ہی سے بڑی شدید تھی اور پوری ہندو قوم میں مسلمانوں کی تقریباً آٹھ سو سالہ غلامی کا ردّ عمل ایک دم پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا ——— مسلمان قوم کے سوادِ اعظم نے اس ابھرتی ہوئی طاقت کے جھکوں اور چڑھتے ہوئے سیلاب کے ریلوں کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ زندگی کے ہر میدان میں ہندوؤں نے منظم طریقے پر مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی اور ان کے نفرت بھرے تعصب کا مظاہرہ ہر سمت ہونے لگا! ——— یہی نہیں بلکہ ہندو امپیریلزم کا یہ عفریت کچھ ایسے انداز اور جوش و خروش سے اٹھا کہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہندوستان کی پوری مسلم قومیت کو ننگ کر بالکل نیست و نابود کر دے۔

یہ حالات تھے جن میں ہندوستان میں مسلم قوم پرستی کی تحریک نے قوت پکڑنی شروع کی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے قومی تشخص کے بقا کی فکر دامنگیر ہوئی۔

بدقسمتی سے اس موقع پر مسلمانانِ ہند کے مذہبی طبقوں اور خصوصاً تحریکِ شہیدینؒ اور جماعت مجاہدین کے معنوی و روحانی وارثوں نے حالات کے رُخ کو سمجھنے میں سخت غلطی کی اور وہ ہندوستان کی پوری مسلمان قوم کے سواد اعظم کے احساسات کا صحیح اندازہ کرنے میں بُری طرح ناکام رہے

اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا اصل سبب کیا تھا؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل سبب وہ حد سے بڑھی ہوئی انگریز دشمنی ہو جو ان کے لائے ہوئے زندقہ و الحاد ——— اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں پر ان کے بے پناہ مظالم سے پیدا ہوئی تھی ——— اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل سبب ان حضرات کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہو جس کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز سے نبٹ لینے کے بعد اپنائے وطن کے مقابلے میں اپنے دین اور اپنے تہذیب و تمدن اور فی الجملہ اپنے قومی تشخص کا تحفظ کچھ مشکل نہ ہوگا ——— بہرحال ہوا یہ کہ ان حضرات نے اپنے لئے یہ راہ متعین کی کہ پہلے ہندوؤں کے

ساتھ مل کر غیر ملکی حکمرانوں سے گلو خلاصی کرا لی جائے۔ ہندو مسلم معاملات اس کے بعد طے ہوتے رہیں گے جبکہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لئے یہ لائحہ عمل طے کیا کہ وہ پہلے ہی سے تحفظات کے حصول کی جدّوجہد کریں گے۔ اور اس امر کی سعی کریں گے کہ وطن اس طور سے آزاد ہو کہ اس میں ان کے جملہ حقوق اور فی الجملہ ان کے قومی تشخص کے تحفظ کی مکمل ضمانت حاصل ہو جائے۔

اس طرح ہندوستان کی مسلمان قوم کے سوادِ اعظم اور اس کے مذہبی طبقات کے مابین بُعد مزید بڑھ گیا ——— بلکہ آزادی کی جدوجہد میں یہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ راہوں پر گامزن ہو گئے ——— ! جوں جوں وقت گزرا یہ بُعد بڑھتا چلا گیا۔ اور بعد میں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے اس میں ضد کا عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ پھر شُدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں بھی رجالِ دین کی آنکھیں کھولنے میں ناکام رہیں!

اس صورت حال کا سب سے اہم نتیجہ، جس کی جانب بہت کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے، یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک قوم کے بہترین افراد سے محروم ہو گئی۔ اب تک قوم کی پوری سیاسی و دینی قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں رہی تھی اور جس میں ایک سے ایک بڑھ کر مخلص و بے نفس محنتی و سخت کوش، آزمودہ و تجربہ کار اور ہر اعتبار سے منجھا ہُوا اور سرد و گرم چشیدہ سیاسی کارکن موجود تھا وہ قوم سے بے تعلق ہو کر رہ گیا ——— (اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج خصوصاً پاکستان میں ہماری قومی زندگی جس شدید قحط الرجال سے دوچار ہے اس کا اصل سبب یہی نہیں ہے!)

ہندوستانی مسلمانوں کی قومی سیاست مذہب سے جس تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی اگر یہ بُعد اسی طرح بڑھتا رہتا تو بات نہ معلوم کہاں تک جا پہنچتی لیکن اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہُوا کہ اس دور میں چند شخصیتیں ایسی بھی ابھریں جنہوں نے اس بُعد کو کم کرنے کی کوشش کی ——— اور اس میں انہیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

ان شخصیتوں میں سرفہرست علامہ اقبال کا نام ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی قومی تحریک میں مذہبی جذبے اور رنگ کی آمیزش کی جو کامیاب کوشش کی وہ ظاہر و باہر ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ 'مذہبی' آدمی ہرگز نہ تھے لہٰذا ان کی کوششوں سے قومی تحریک میں کم از کم وقتی طور پہ مذہبی روح تو ایک حد تک پیدا ہو گئی لیکن 'مذہبی طبقوں' سے اس کا بُعد کسی طرح کم نہ ہُوا۔

علامہ کے ساتھ ہی ایک دوسری عظیم شخصیت جس نے ایک بار حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ لگا کر اُمتِ مسلمہ کی "شیرازہ بندی" کو آواز دی اور 'امام الہند' کا خطاب پایا وہ مولانا ابو الکلام مرحوم کی تھی۔ انہوں نے

"الہلال" اور "البلاغ" کی ولولہ انگیز دعوت کے ذریعے ایک بار اسلامیان ہند کے دل میں پھر سے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی ۔ لیکن وہ غالباً خود اپنی شخصیت کو احیائے دین کی ہمہ گیر کوشش کے لئے غیر موزوں گمان کر بیٹھے ہیں ۔۔۔ جبکہ ابھی ان کی زوردار دعوت کی صدائے بازگشت خود ان کے اپنے کانوں تک بھی نہ پہنچ پائی تھی اس کام سے دست بردار ہو گئے ۔۔۔ تاہم ان کی دعوت سے بھی وقتی طور پر ایک دینی جذبہ ہندوستان کی پوری مسلم قوم میں تازہ ہو گیا ۔

"امام الہند" کی دعوت کی گھن گرج کچھ کم ہوئی ہی تھی کہ ایک تیسری شخصیت جسے ان ہی کی شخصیت کا معنوی تسلسل قرار دیا جا سکتا ہے انہیں ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کے عزائم کے ساتھ سامنے آئی ۔۔۔ یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے ! جو اگرچہ معروف "مذہبی حلقوں" سے تو منسلک نہ تھے لیکن ان کی "مذہبیت" بہرحال مسلّم تھی ! انہوں نے ایک طرف ان "مذہبی حلقوں" پر شدید تنقید کی جو ہندوستان کی اکثریت کے عزائم سے بے خبر آزادی کی محبت اور انگریز دشمنی کے جذبے سے مغلوب ہو کر ایسی راہ پر چل پڑے تھے جس کا نتیجہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا قیام اور اس میں مسلمانوں کی قومیت کا کلی انضمام تھا ۔۔۔ اس طرح ان کے قلم نے گویا پہلی بار مسلمانانِ ہند کے سوادِ اعظم کے دلی احساسات کی ترجمانی مدلل و مفصل طور پر کی ! چنانچہ قوم نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا ۔۔۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے مخصوص کلامی انداز میں ہندوستان کے مسلمانوں کو دین کی طرف متوجہ کیا اور مغرب کے ملحدانہ افکار و نظریات کا پرزور ابطال کر کے اسلام کی حقانیت اور خصوصاً اس کے ایک مکمل اور بہترین نظامِ حیات ہونے کو واضح کیا ۔۔۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے ایک بڑی تعداد میں مسلمان نوجوان خصوصاً وہ جو انگریزی تعلیم یافتہ اور اس سے پہلے مغربی تہذیب و تمدن کے دلدادہ تھے دین کی جانب راغب ہوئے ۔۔۔ اور ایک بار پھر یہ امید بندھی کہ ہندوستان کی مسلم قومیت اور اسلام کا رشتہ از سرِ نو استوار اور مضبوط و مستحکم ہو جائے گا ۔

لیکن جلد ہی یہ امید منقطع ہو گئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تحریک دوسرے بڑے حادثے سے دوچار ہو گئی ۔۔۔ یعنی مولانا مودودی مسلمانوں کی قومی تحریک سے علیحدگی اختیار کر کے ہندوستان کی مسلمان قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ گئے اور ایک دوسری راہ پر گامزن ہو گئے ۔

اپنے رخ کی اس تبدیلی کی جو دو بڑی وجوہات مولانا نے بیان فرمائیں وہ انہی کے الفاظ میں سنیئے :۔

"پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دور میں عامۃ المسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبے کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لئے کام کر رہا ہے ۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا ہی

نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اس قدرِ قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال اسلام کے لئے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کمبخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس تحریک کے اندر داعیہ دینی کے بجائے داعیہ قومی کو بہت زیادہ کار فرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جز اتنا کم اور قوم پرستانہ جز اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایسا ہی ایک امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں۔ اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ دیباچہ)

اگرچہ بہت سے لوگوں کے نزدیک مولانا مودودی کی مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد سے کنارہ کشی کا اصل سبب بالکل ذاتی تھا۔ چنانچہ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے متذکرہ صدر کالم نویس صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مولانا نے تحریک پاکستان سے اپنی کنارہ کشی کا کبھی کوئی سبب بیان نہیں فرمایا (؟) لیکن اس کی وجہ بہر حال تھی اور یادنی تامل جو بات معلوم ہو جاتی وہ یہ ہے کہ مولانا نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا پرچار اس امید میں کیا تھا کہ وہ اپنی قیادت انہی کو سونپ دیں گے لیکن جب یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں نے جس شخص کی صدا پر کان دھرا وہ بجائے ان کے قائدِ اعظم تھے تو انہوں نے فوراً اس پورے نقشہ کا رخ ہی موڑ دیا ..... (گویا) مولانا مودودی کی غداری کا اصل سبب خالص ذاتی تھا ——!"

لیکن اس وقت ہم اس بحث میں الجھنے کو سعیِ لاحاصل سمجھتے ہیں۔ بلکہ ہمارے نزدیک مولانا نے

۱۹۴۱ء میں مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک سے کٹ کر اپنے لئے جو کام تجویز کیا — یعنی قومی سطح سے بلند اور گروہی مفادات سے بالا ہو کر خالصتہً اللہ کے دین کی دعوت اور تبلیغ و اشاعت اور وہ بھی خالص علمی و فکری انداز میں — وہ یقیناً قومی جد و جہد کے مقابلے میں بہت اعلیٰ و ارفع تھا۔

تاہم قومی جد و جہد کے نقطۂ نظر سے مولانا مودودی کے رخ کی یہ تبدیلی سخت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کے اسلام سے حقیقی و معنوی بُعد میں مزید اضافہ ہو گیا بلکہ طبقۂ متوسط کے نہایت مخلص اور سرگرم کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی قومی جد و جہد سے لاتعلق ہو گئی۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کا عرصہ ہندوستانی سیاست میں حالات و واقعات کی انتہائی تیز رفتاری کا دور ہے۔ دوسری جنگ عالمگیر کے بعد ایک طرف خود انگریزوں[1] نے یہ محسوس کر لیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک ہندوستان پر اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ دوسری طرف[2] انڈین نیشنل کانگرس کے جھنڈے تلے ہندوؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے جد و جہد آزادی کو تیز تر کر دیا اور تیسری[3] طرف مسلمانانِ ہند کا سوادِ اعظم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے حصولِ پاکستان کی جد و جہد میں مشغول ہو گیا۔

اس جد و جہد کے آخری زمانے میں جبکہ مسلم لیگ کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بالکل واضح اور متعین کر دے کہ وہ اسلامیانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور پوری مسلمان قوم یکسوئی کے ساتھ اس کے جھنڈے تلے جمع ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے دینی جذبات کو اپیل کرتی اور اسلام سے ان کی محبت اور دلی تعلق کو کام میں لاتی — چنانچہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں پورا ہندوستان "پاکستان کا مطلب کیا — لا الٰہ الا اللہ!" کے نعروں سے گونج اٹھا اور اسلامی حکومت، اسلام کے اصولِ مساوات و اخوت — اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی قانون و دستور کی اصطلاحات کا استعمال مسلم لیگ کے رہنماؤں کی تقریروں میں عام ہو گیا۔ گویا اس دور میں تحریکِ مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف قومی مفادات کی محافظ ہی نہیں بلکہ دین کے ساتھ ان کی محبت اور اسلام کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کا مظہر بھی بن گئی۔ چنانچہ پوری قوم مجتمع ہو کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور خود مذہبی طبقات میں سے بھی کچھ لوگ اس کی امداد کے لئے میدان میں نکل آئے[4]

تاہم یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہ تحریکِ مسلم لیگ کا وہ دور تھا جس میں کسی تحریک کے واقعی نظریات اور حقیقی افکار کے بجائے خوش آئند جذبات اور نیک خواہشات[5] کی عملداری ہوتی ہے اس دور کی کہی سنی باتوں پر

---

[1] یعنی برطانوی مکتبِ فکر کے علماء و مشائخ کی اکثریت اور حلقۂ دیوبند سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقائے کار اور کچھ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے متوسلین۔

[2] یعنی رومانویت (ROMANTICISM)

کسی مستحکم تعمیر کا خیال باندھنا ایک بچگانہ خواہش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

خود مولانا مودودی اس دور میں قومی زندگی کی منجدھار سے دور بیٹھے عمرانیات کے ان اٹل اصولوں کا درس دیتے رہے کہ :-

"حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر ادھر سے لاکر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تفاعل سے طبعی طور پر ہوتی ہے اس کے کچھ ابتدائی لوازم، کچھ اجتماعی حرکات، کچھ نظری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور ظہور کرنے سے یہ وجود میں آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ ۔ ۔ اس خام خیالی[1] کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو مگر خالص علمی طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔"

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں ۔ ۔ ۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم : اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے)

اور پھر جوں جوں قومی تحریک زور پکڑتی اور پوری مسلمان قوم کو اپنے دامن میں سمیٹتی چلی گئی ان کی تنقیدیں بھی تلخ تر ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ ان میں نفرت و حقارت کی آمیزش بھی ہو گئی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۷ء میں ٹونک میں انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں یہ فرما دیا کہ :-

"اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔"

اور "یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بناتے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں، تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے ۔ ۔ ۔" (روداد جماعت اسلامی)

سارے ہندوستان کا پاکستان بننا تو تقدیر الٰہی میں نہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خصوصی

---

[1] یعنی یہ امید کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہو گا۔

فضل و کرم ہی سے ہؤا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان جیسا کچھ بھی ہے عالم وجود میں آگیا۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام عمرانیات اور سیاسیات کے طالب علموں کے لئے ایک معجزہ سے کسی طرح کم نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک میں ابھی ہرگز اتنی قوت اور بل بوتہ نہ تھا کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس کی صورت میں ہندو امپیریلزم کے چنگھاڑتے ہوئے عفریت کی خواہشات کے علی الرغم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے کچھ لوگ اس میں انگریزوں کی سیاست کا دخل گردانتے ہیں لیکن کبھی ابتدائی دور میں چاہے تحریک مسلم لیگ پر کسی انگریز گورنر جنرل یا وائسرائے کی نظر کرم رہی ہو یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے کہ آزادئ ہند سے متصلاً قبل —— اور خصوصاً برطانیہ میں لیبر پارٹی کے برسراقتدار آجانے کے بعد انگریزی حکومت کا رویہ مسلم لیگ کے ساتھ واضح طور پر معاندانہ رہا —— اور ہندوستان کے آخری انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بارے میں تو سب کو یہ معلوم ہے کہ وہ کانگرس کے علانیہ طرفدار اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔

بنا بریں اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کا قیام اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی مشیت تھی جو ہندوؤں اور انگریزوں کی متفقہ مخالفت کے علی الرغم پوری ہوئی تو اس میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے!

ہم نے اسلامیان ہند کی تقریباً سوا سو سالہ تاریخ کے ان چند اہم نقوش کو صفحۂ قرطاس پر اس لئے منتقل کیا ہے کہ تحریک پاکستان کا صحیح پس منظر نگاہوں کے سامنے آجائے اور صورت واقعہ جیسی کچھ کہ فی الحقیقت ہے ظاہر ہو جائے۔ اس لئے کہ صحیح طرز عمل اور درست سمت میں اقدام کا تمام تر انحصار اسی پر ہے۔ نیک خواہشات کی عمل داری بسا اوقات انسان کے نقطۂ نظر کو غلط کر کے رکھ دیتی ہے اور میدان سیاست میں اترنے کے بعد بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک غلط موقف جو ابتدا میں محض "حکمت عملی" کے تحت اختیار کیا جاتا ہے، بعد میں جماعتوں اور تحریکوں کے اپنے نقطۂ نظر میں مستقل طور پر ایسی کجی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے جو پھر اس کے گلے کا ہار بن جاتی ہے اور کسی طور سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ نتیجۃً بالکل مخالف سمت میں سفر کے باوجود یہ توقع برقرار رکھی جاتی ہے کہ بس

ع "اس موڑ کے آگے منزل ہے مایوس نہ ہو بڑھتا جا!"

آئندہ صحبت میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہم قیام پاکستان کے بعد کے بیس سالوں کا جائزہ اسی نقطۂ نظر سے لیں گے —— اور پھر ہمارے نزدیک اسلام اور پاکستان دونوں کے ساتھ خلوص اور خیر خواہی کا تعلق رکھنے والے لوگوں کو جو طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اسے بیان کریں گے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم ۔ (میثاق، مارچ ۱۹۶۷ء: "تذکرہ و تبصرہ")

قیام پاکستان کے بعد

مذہبی طبقات کا طرزِ عمل

ہونا کیا چاہیئے تھا، ہوا کیا؟

پاکستان کا قیام ہرگز ایک معمولی واقعہ نہ تھا ——— دنیا کے نقشے پر اس طرح اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر وقت کی عظیم ترین مسلمان مملکت کا رونما ہو جانا یقیناً مشیّت ایزدی اور حکمتِ خداوندی میں کسی بڑی تدبیر کے سلسلے کی کڑی تھا ——— اور اب ضرورت اس امر کی تھی کہ قوم کے تمام طبقات اسے ایک عطیۂ خداوندی اور نعمتِ خداداد سمجھتے اور ماضی کے تمام اختلافات کو بھلا کر کامل توافق و تعاون کے ساتھ اس کی تعمیر میں لگ جاتے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اُس قومی قیادت پر جو اس کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی تھی اور جس کے ہاتھوں میں اس کی حکومت کے تمام اختیارات آئے تھے اچانک بہت سی عظیم اور کٹھن ذمہ داریاں عاید ہو گئی تھیں۔ اس کا فرض تھا کہ ایک طرف اس کے بقا و تحفظ اور دفاع و استحکام کا بندوبست کرتی اور اس کی انتظامی مشینری کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق از سرِ نو استوار کر کے تعمیری و ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد شروع کرتی ——— اور دوسری طرف قوم کی سیاسی تربیت کا ایسا بندوبست کرتی جس سے اس میں سیاسی شعور نشو و نما پاتا، خیالات میں یک رنگی اور مقاصد میں ہم آہنگی پیدا ہوتی۔ قومی و ملّی احساسات اجاگر ہوتے اور صحت مند سیاست کے خطوط متعین ہوتے چلے جاتے! ——— پاکستان کے بقا اور تحفظ و ترقی کے لئے فوری طور پر اگرچہ مقدم الذکر کام اہم تر تھا ——— لیکن دیرپا استحکام اور ٹھوس تعمیر کے نقطہ نظر سے موخر الذکر کام کہیں زیادہ ضروری تھا!

مذہبی و نیم مذہبی طبقات کو۔ خواہ اس سے کہ پہلے وہ پاکستان کے شدید مخالف تھے یا بزعمِ خویش کسی عظیم تر منصوبے پر عمل پیرا رہے تھے۔ لازم تھا کہ وہ قیامِ پاکستان کو قدرت کا اشارہ سمجھ کر آئندہ کے لئے اپنے نقطہ نظر کو بالکل تبدیل کر لیتے اور اسے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ بنانے کے لئے مثبت

تعمیری جد وجہد میں یہ دل و جان مصروف ہو جاتے۔ اس کے لئے ایک طرف یہ ضروری تھا کہ ہر گروہ اپنے مزاج کی مناسبت اور اپنی اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے تناسب سے اس عظیم جد وجہد کے کسی ایک شعبے کو سنبھال لیتا اور دوسری طرف یہ لازمی تھا کہ انتشار و افتراق کے تمام رخنوں کو قطعی طور پر بند کر دیا جاتا اور قومی قیادت کے ساتھ حتی الامکان تعاون کی روش اختیار کی جاتی۔

وہ مذہبی حلقے جو جمعہ و جماعت اور درس و خطابت کے ذریعے عوام سے قریب ترین ربط و تعلق رکھتے تھے اور ان میں گہرے اثر و نفوذ کے مالک تھے۔ مذہبی، اخلاقی اور روحانی اقدار کے احیاء کے لئے انتہائی مؤثر کام کر سکتے تھے ——— اور جماعت اسلامی علمی و فکری سطح پر اسلامی انقلاب اور تہذیبی و ثقافتی میدان میں دینی اقدار کے احیا کے لئے قیمتی خدمات سرانجام دے سکتی تھی۔

اس اعتبار سے جماعت اسلامی واقعتہً ایسی پوزیشن میں تھی کہ اپنے پیش نظر ہمہ گیر اور عالمگیر اسلامی انقلاب کے قیام کے لئے پاکستان کو ایک بہترین موقع کے طور پر استعمال کر سکتی تھی۔

> مولانا مودودی نے چھ سات سال مسلمانانِ ہند کی قومی جد و جہد اور عام سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ رہ کر جو کام کیا تھا اس کے نتیجے میں انہوں نے ایک ایسی جمعیت فراہم کر لی تھی جو ایک اچھی بھلی تعداد میں ایسے مخلص اور سرگرم اور ساتھ ہی نظم اور باقاعدگی اور سلیقے اور قرینے کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت سے مسلح کارکنوں پر مشتمل تھی جن میں کم از کم اسلام کو دنیا میں سربلند کرنے کی حد تک اپنے مقصد اور نصب العین کا واضح شعور بھی موجود تھا اور اس کے لئے محنت و مشقت کے مادے اور ایثار و قربانی کے جذبے کی بھی کمی نہ تھی۔

اور سب سے اہم یہ کہ اس جمعیت میں دین و دنیا اور قدیم و جدید کا وہ امتزاج بھی موجود تھا جو اس دور میں دین کی کسی بھی مؤثر خدمت کے لئے لازمی اور لابدی ہے۔ اس اعتبار سے یہ جمعیت مسلمانوں کے جدت پسند اور قدامت پرست طبقات کے مابین ایک 'امتہً وسطیٰ' کا رول ادا کر سکتی تھی اور سراپا جامد مذہبیت اور از سرتاپیر متحرک متجددیت کے درمیان 'سواء السبیل' کو واضح و روشن کر سکتی تھی۔

کاش کہ قوم کے ان تینوں اہم طبقات میں بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کا شعور بروقت پیدا ہو جاتا اور وہ کامل توافق و تعاون کی فضا میں اپنے اپنے حصے کے کاموں میں منہمک ہو کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنے میں لگ جاتے ——— لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا ———!!

جہاں تک قومی قیادت کا تعلق ہے اگرچہ اس غریب پر قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی مختلف خارجی و داخلی اسباب کی بنا پر نزع کا عالم طاری ہو گیا تھا جس کی بنا پر پاکستان کے بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کے کام تو جیسے کچھ اور جتنے کچھ اس سے بن آئے اس نے کئے لیکن سیاسی میدان میں قوم کی تنظیم و تربیت اور قومی شعور اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے کا کام وہ بالکل نہ کر پائی۔ تاہم جہاں تک تعاون و توافق کا تعلق ہے اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہیئے کہ پاکستان کی پہلی قومی قیادت کی جانب سے اس سلسلے میں تنگ دلی اور بخل کا مظاہرہ قطعاً نہیں ہوا ——— اور اس کے باوجود کہ بعض مذہبی حلقوں نے کھلم کھلا قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی ——— اور خود مولانا مودودی بھی نہ صرف یہ کہ اس سے بالکل علیحدہ رہے تھے بلکہ تحریک پاکستان کے آخری اور فیصلہ کن ایام میں اس پر شدید اور بعض اوقات دلآزار قسم کی تنقیدیں بھی کرتے رہے تھے۔ تاہم اپنا وقت آنے اور قوت و اقتدار پر بلاشرکت غیرے قابض ہونے کے بعد اس نے نہ صرف یہ کہ آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے متمتع اور مستفید ہونے کے معاملے میں مسلم لیگ کے حامیوں اور مخالفوں کے مابین فرق و امتیاز کا کوئی شائبہ بھی کبھی پیدا نہ ہونے دیا ——— بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تعاون کے دروازے پوری طرح کھول دیئے جس کی روشن ترین مثال یہ ہے کہ خود مولانا مودودی کو اپنے خیالات کے اظہار اور اپنے نظریات کی اشاعت کے بھرپور مواقع نہ صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بلکہ ریڈیو تک پر پوری وسعت قلب کے ساتھ مہیا کئے۔

اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ ایک قومی جماعت ہونے کی بنا پر مسلم لیگ کی صفوں میں ہر نقطہ نظر اور مکتبہ فکر کے لوگ پائے جاتے تھے، حتیٰ کہ خالص ملحد اور دہریے بھی موجود تھے ——— لیکن پاکستان میں اس کی جو پہلی ٹیم برسر اقتدار آئی اس میں مخلص قوم پرست مسلمان بلکہ خاصے مذہبی مزاج اور دینی مذاق کے لوگوں کو ایک فیصلہ کن پوزیشن حاصل تھی ——— !

اور اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے بہترین حکمت عملی یہ تھی کہ تمام دینی جماعتیں اور مذہبی حلقے پچھلے ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر کھلے دل کے ساتھ قومی قیادت کے ساتھ تعاون کی روش اختیار کرتے اور ایک طرف اپنی تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں اور اخلاقی و عملی اصلاح کے کاموں میں مواقع اور مسائل کے اس اضافے سے فائدہ اٹھاتے جو مسلمانوں کی قومی ریاست میں حکومت کے ساتھ تعاون کی صورت میں متوقع تھا ——— اور دوسری طرف قومی قیادت کے مخلص اور مذہبی رجحان رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط بناتے ——— لیکن افسوس کہ صرف مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے

رفقائے کار کو چھوڑ کر انہوں نے تو حصول پاکستان کی جدّوجہد میں بھی مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا تھا اکثر مذہبی حلقوں نے یا تو لاتعلقی کی روش برقرار رکھی یا محاندانہ انداز اختیار کر لیا۔

فعّال نیشنلسٹ علماء کی اکثریت اور ان کے اصل مراکز تو ہندوستان ہی میں رہ گئے تھے۔ پاکستان کے حصے میں جو لوگ آئے ان میں سے مجلس احرار نے بظاہر بہت عقلمندی سے کام لیا اور سیاست کے میدان سے عملاً کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی سرگرمیوں کو صرف دینی و مذہبی دائرے میں محدود کر لیا۔ لیکن ایک طویل عرصے تک کارزارِ سیاست میں گھمسان کی لڑائی لڑ چکنے والوں کے لئے سیاست سے کامل علیحدگی مشکل تھی چنانچہ چند ہی سال بعد ان کی مجبوس سیاسیت، ایک آتش فشاں کے مانند پھٹ کر رہی اور پاکستان کی سیاسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس حادثے نے پاکستان کی قومی و سیاسی زندگی کی گاڑی کو پٹڑی سے اتارنے میں اہم ترین حصہ ادا کیا ——!

علمائے دین کی ایک عظیم اکثریت نے قومی و سیاسی زندگی سے ایک گونہ لاتعلقی کی اس روش کو برقرار رکھا جس پر وہ تقریباً پون صدی سے عمل پیرا تھے اور پاکستان آکر بھی وہ حسب سابق کلیتہً تعلیمی و تدریسی مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ چنانچہ یہ تو ضرور ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کئی نئی اور عظیم دینی درسگاہیں پاکستان میں قائم ہو گئیں جن میں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں زور شور سے بلند ہونے لگیں اور اس اعتبار سے یقیناً ایک قابل قدر اور بیش قیمت کام سرانجام پا گیا —— لیکن یہ بھی بجائے خود ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کی ایک بڑی اکثریت کے قلب و دماغ نے قیام پاکستان کے بعد حالات میں جو تبدیلی آئی تھی اس سے کوئی اثر قبول نہ کیا —— اور نہ صرف یہ کہ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے قیام پاکستان کو کوئی اہم واقعہ سمجھ کر اس کے زیر اثر اپنے نقشۂ کار حتیٰ کہ اپنے تعلیمی و تدریسی معمولات یہاں تک کہ نصاب ہی میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہو بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ واقعہ کہ حکومت کی باگ ڈور غیر ملکی اور غیر مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمان قوم کے اپنے ہاتھ میں آگئی تھی، قطعاً کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا اور وہ اپنے ذہنوں میں نئے مسلمان حکمرانوں کو بالکل اسی مقام پر رکھ کر اپنے سابقہ طریق کار پر عمل پیرا رہے جس پر ان سے پہلے کے حکمران تھے۔

> بدقسمتی سے قومی قیادت کے بعض عناصر اور پاکستان کی مختلف سروسز کے اعلیٰ افسروں کی اکثریت نے مغربی طرزِ فکر اور یورپی طرزِ بود و باش کو جس حد تک اختیار کر لیا تھا اس کے پیش نظر مذہبی طبقات کا یہ طرزِ عمل کسی حد تک فطری بھی تھا۔

بہرنوع ہوا یہ کہ قومی قیادت اور مذہبی حلقوں میں جو بعد قیام پاکستان سے پہلے تھا وہ علیٰ حالہ

قائم رہا ——— اور اجنبیت اور غیریت کے پردے جوں کے توں حائل رہے۔ اور اگرچہ علما کی ایک بڑی اکثریت نے اپنے آپ کو سیاسی سرگرمیوں سے دور ہی رکھا لیکن اس مغائرت اور بُعد کی بنا پر یہ بہرحال ہوا کہ عدم اطمینان کی ایک کیفیت ان میں مستقل طور پر موجود رہی جس سے مختلف سیاسی گروہ وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہے!

رہی جماعتِ اسلامی جو اس دور میں احیائے اسلام کی سعی و جہد کے لئے سب سے زیادہ صلاحیت اور استعداد کی حامل تھی تو اس نے پاکستان میں جو طریق کار اختیار کیا وہ اس داستان کا الم ناک ترین باب ہے اور اس کی بدولت اس کی تمام قوتیں اور توانائیاں ایسے تخریبی راستوں پر پڑ گئیں جن سے نہ صرف یہ کہ ملک و ملت کو شدید نقصان پہنچا بلکہ خود اسلام کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں!

۱۹۳۹/۴۰ء میں مولانا مودودی مسلمانانِ ہند کی قومی جد و جہد سے یہ کہہ کر علیحدہ ہوئے تھے کہ محض نام کے مسلمانوں کی تنظیم سے اسلامی حکومت کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی، اس کے لئے لازم ہے کہ پہلے علمی و فکری اور ذہنی و نظری سطح پر اسلامی انقلاب برپا کیا جائے اور پھر معاشرے میں اخلاقی و عملی تبدیلی اس حد تک پیدا کر دی جائے کہ اس میں کسی جاہلی نظام کا چلنا دشوار ہو جائے، حکومت اور ریاست کی سطح پر کسی واقعی اور پائیدار تبدیلی کی توقع اس کے بعد ہی کی جا سکتی ہے لہٰذا ہم مسلمانوں کی قومی جد و جہد کا ساتھ دینے میں اپنا وقت ضائع اور اپنی منزل کھوٹی کرنے کو تیار نہیں ہیں بلکہ اسی فطری طریق پر عمل پیرا ہو کر پہلے علمی و فکری ——— اور اخلاقی و عملی انقلاب برپا کرنے کی سعی کریں گے ——— چنانچہ قومی تحریک سے علیحدہ ہو کر مولانا نے علمی و فکری سطح پر اسلام کی دعوت دینے اور جو لوگ اسے قبول کر کے اسلام کے اوامر و نواہی کے عملاً پابند ہوتے چلے گئے انہیں ایک تنظیم میں منسلک کرنے کا کام شروع کر دیا

> قیامِ پاکستان کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مولانا اپنے اسی طریق پر عمل پیرا رہتے اور جس قدر ممکن ہوتا اپنے اسی کام کی رفتار تیز تر کر دیتے اور اس کے ضمن میں مواقع و وسائل کے اس اضافے سے فائدہ اٹھاتے جو ایک مسلمان مملکت میں متوقع تھا اور جن کے ضمن میں، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں پاکستان کی پہلی قومی حکومت کی جانب سے ہرگز کسی بخل کا مظاہرہ نہیں ہوا! ———!

لیکن افسوس کہ اس موقع پر ان کی ذہانت نے ایک بالکل ہی نیا پینترا بدلا۔ چنانچہ اچانک ان کے دل میں اپنی اس 'قوم' کا درد اٹھا جس کی قومی جد و جہد کے دوران وہ ایک خاموش تماشائی ہی نہیں رہے تھے بلکہ دور کھڑے ہو کر طنز و استہزا کے تیر برساتے رہے تھے اور انہوں نے قوم کی حالتِ زار پر رحم

کھاتے ہوئے اس کی 'سرپرستی' قبول فرمائی اور اس کی رہنمائی کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ مولانا کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"..... اس لئے جس روز تقسیم ملک کا اعلان ہوا، اسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بھی یا بھلی تعمیر ہم آج تک کرتے ہیں اب اسی پر اکتفا کرنی ہوگی اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی و اجتماعی صلاح کے بغیر یک لخت با اختیار ہو گئی ہے ....."

ساتھ ہی وہ ان مطالبات کے ساتھ سیاست کی عین منجدھار میں کود پڑے کہ :-

(۱) چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور حصول پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی ——— اور چونکہ یہی اس ملک کے نوسو ننانوے فی ہزار باشندوں کی دلی خواہش ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ یہاں اسلامی دستور نافذ ہو اور شریعت اسلامی رائج کی جائے اور ———

(۲) چونکہ مسلمانوں کی قومی قیادت اب تک جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے وہ ایک اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاری محض ہیں لہٰذا انہیں چاہیئے کہ وہ مسند قیادت و سیادت سے دستبردار ہو جائیں اور ایک 'نئی قیادت' کے لئے جگہ خالی کر دیں ——— [1]

اس طرح گویا مولانا مودودی نے احساس فرض سے مجبور ہو کر بیک وقت اسلام اور پاکستانی قوم دونوں کی سرپرستی کا بوجھ، اپنے سر لے لیا !!

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کی قومی قیادت بہت سی داخلی و خارجی مشکلات میں مبتلا تھی۔ ایک طرف ایک بالکل نئی لیکن وسیع و عریض اور دو انتہائی دور دراز خطوں پر مشتمل سلطنت کے پیچیدہ مسائل و معاملات تھے جن کا حل اور وہ بھی انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بجائے خود ایک کٹھن مرحلہ تھا، پھر اس پر تبادلۂ آبادی اور مہاجرین کی آبادکاری کے مہیب مسائل مستزاد ہو گئے۔ دوسری طرف بانی پاکستان اور ان کے دست راست قیام پاکستان کے بعد جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تیسری طرف قومی تحریک میں مخلص، بے نفس اور تربیت یافتہ کارکنوں کی کمی کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے اور قومی کارکنوں

---

[1] واضح رہے کہ یہ کوئی اقتباس نہیں ہے بلکہ جماعت اسلامی کے بعد از قیام پاکستان کے موقف کی مختصر ترجمانی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے راقم الحروف کی تالیف "تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ"

کی ایک بڑی اکثریت الاٹ منٹوں کے چکر اور پرمٹوں اور لائسنسوں کے حصول یا قوت و اقتدار کی کشمکش میں الجھ کر رہ گئی ——— قومی قیادت کے مخلص عناصر ابھی اس صورت حال سے نپٹنے کی فکر کر ہی رہے تھے کہ مولانا مودودی اپنی مختصر لیکن منظم جمعیت کو لے کر میدان میں آ گئے اور انہوں نے پروپیگنڈے کی ایک موثر تکنیک سے ملک بھر میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔ چنانچہ قومی قیادت ایک نئے اور پیچیدہ مسئلے سے دوچار ہو گئی!

قومی قیادت کے لئے اس مسئلے کی پیچیدگی کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ جس اسلام کے نام پر مولانا مودودی سیاست کے میدان میں اترے تھے وہ نہ صرف یہ کہ خود کا اپنا دین تھا بلکہ قریبی زمانے میں خود اس نے اسی کے نام پر عوام کے جذبات کو اپیل کیا تھا ——— لہٰذا مولانا مودودی کے مطالبہ کا کوئی براہ راست جواب اس کے لئے ممکن نہ تھا ——— دوسری طرف اسے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ صورتِ حال ایسی بنا دی گئی ہے کہ اسلام کی جانب کسی قدم کا اٹھانا مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی دینی قیادت کے سامنے پسپائی کے مترادف ہوگا۔ اس کا ایک بین ثبوت اس وقت مل بھی گیا جب دستور داد مقاصد کو جو اصلاً خود تحریک مسلم لیگ کے مخلص اور دیندار عناصر (خصوصاً مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) کی کوششوں سے منظور ہوئی تھی، جماعت اسلامی نے اپنی 'فتح مبین' قرار دے لیا! ——— لہٰذا قومی قیادت نے کچھ لیت ولعل سے کام لینا شروع کیا، کچھ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر ہیر پھیر کے راستوں سے حملے شروع کئے اور کبھی کبھی اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے مطالبے کی براہِ راست مخالفت بھی کی ——— اس معاملے میں پاکستان کی سیاست میں جو عجیب الجھاؤ پیدا ہو گیا تھا اس کا کسی قدر اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قومی قیادت کی جانب سے اول اول جو لوگ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف دلائل و براہین کے ہتھیار لے کر میدان میں اترے وہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب جیسے پابند صوم و صلوٰۃ اور دینی درد اور مذہبی جذبہ رکھنے والے لوگ تھے[1] ———!

گویا جن لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے میں ملک و ملت اور دین و مذہب دونوں کی بھلائی تھی غلط حکمتِ عملی کی بنا پر انہی کو دشمنوں کی صف میں لا کھڑا کیا گیا ——— !! اور اسلام کو سیاسی میدان کا ایک مسئلہ بنا کر اسے اپنے بہترین بہی خواہوں کی سرپرستی سے محروم کر دیا گیا ——— ! ———!

---

[1] بعد میں اس صف میں ایک اہم اضافہ مسٹر اے کے بروہی کا ہوا جنہوں نے اس شخص کو انعام دینے کا اعلان کیا جو ثابت کر دے کہ قرآن مجید میں کسی دستور ملکی کا خاکہ موجود ہے!

کاش کہ مولانا مودودی سمجھ سکتے کہ انہوں نے اس طریق کار کو اختیار کرکے اسلام کی راہ میں کیسے کانٹے بو دیئے تھے!

'مذہبی سیاست' کے اس میدان میں اوّلاً مولانا مودودی نے تنہا اپنے اور اپنی جمعیت کے زورِ بازو کے بل پر چلنے کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ دوسرے دینی حلقوں کی مدد اور تعاون کے بغیر کامیابی مشکل ہے۔ چنانچہ انہوں نے وقتاً فوقتاً علمائے دین کا اشتراک و تعاون حاصل کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ کبھی انہیں اپنے پیچھے لگا کر اور کبھی حالات کا رخ دیکھتے ہوئے ان کے پیچھے لگ کر (جیسا کہ اینٹی قادیانی تحریک کے زمانے میں ہوا) ایک 'دینی کیمپ' کا تصوّر پیدا کیا ——— اس کے دو انتہائی مضر نتائج برآمد ہوئے: ایک[1] یہ کہ سیاست کے میدان میں جماعت اسلامی کے ساتھ علمائے دین بھی قومی قیادت کے حریف بن گئے اور رفتہ رفتہ برسرِ اقتدار طبقہ اور 'رجالِ دین' دو مخالف و معاند گروہوں کی صورت اختیار کرتے چلے گئے ——— اور دوسرے[2] یہ کہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کو جدّت پسندی اور از سرتا پیر متحرک مجتہدیت ——— اور قدامت پرستی اور سراپا جامد مذہبیت کے مابین ایک 'اُمّتِ وسطیٰ' کی پوزیشن کو ترک کرکے کلیتہً قدامت پرستی اختیار کرنی پڑی اور اگرچہ اس کی بنا پر بہت سے دلچسپ تضادات ظہور میں آئے مثلاً یہ کہ اس شخص کو جو تنہا اپنی ذات پر بھی 'فقہ حنفی' کو پوری طرح نافذ کرنے کو تیار نہ تھا بلکہ اس میں اپنا 'اقوال' لگانا ضروری خیال کرتا تھا یہ موقف اختیار کرنا پڑا کہ دس گیارہ کروڑ افراد کی ایک پوری قوم پر صدیوں پیشتر کی مرتب شدہ فقہ حنفی کو جوں کا توں نافذ کر دیا جائے[1]! لیکن مولانا پر جلد از جلد مسند حکومت پر پہنچ کر 'قوم' اور 'مذہب' دونوں کو سنبھالنے کا جو خبط سوار ہو گیا تھا اس کے پیشِ نظر یہ قربانیاں بہرحال بہت حقیر تھیں ع

ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دل کی خاطر!

(میثاق اپریل ۱۹۶۷ء)

---

[1] اسی سلسلے کا ایک دلچسپ لطیفہ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے سنایا کہ ایک موقع پر علماء کے ایک ایسے مشترکہ بیان پر مولانا مودودی نے ان سے بھی دستخط کرانے چاہے جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کی جائے۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے فرمایا "اس پر میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے قتل کے حکم نامے پر میں خود دستخط کر دوں"

سیاسی افراتفری سے ایوبی آمریت تک

جماعت اسلامی کا رقیبانہ کردار

اور علماء کا معاندانہ طرزِ عمل

جیساکہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، پاکستان کی قومی قیادت پر عالم نزع تو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی طاری ہوگیا تھا اور وہ خود اپنے داخلی انتشار کی بنا پر، جو بیک وقت نظریاتی بھی تھا اور اخلاقی بھی، ادھ موئی ہو چکی تھی۔ اس پر رہی سہی کسر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تند و تلخ تنقیدوں اور عوام کے مذہبی جذبات کے اشتعال نے پوری کر دی اور قیامِ پاکستان کے بعد چند ہی سالوں کے اندر اندر وہ مسلم لیگ جو اس کے قیام کا ذریعہ بنی تھی نسیاً منسیاً ہو گئی۔

> ختم تو مسلم لیگ از خود بھی ہو ہی جاتی لیکن مولانا مودودی نے مسلمانانِ ہند کی قومی جد و جہد کے عین عروج کے موقع پر اس سے علیحدگی اختیار کر کے قوم کے ساتھ جس 'ہمدردی' اور 'خیر خواہی' کا ثبوت دیا تھا اسی کا لازمی تقاضا غالباً یہ بھی تھا کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد وہ اپنی مختصر لیکن منظم جمعیت کو لے کر مسلم لیگ کی سرکوبی کے لئے میدان میں آجاتے اور اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے میں بھی بنفسِ نفیس شرکت فرماتے! ——————!

لطف کی بات یہ ہے کہ اُس وقت کی علیحدگی کے لئے تو یہ وجہ جواز پیش کی گئی تھی کہ اسلام کسی بھی 'قوم پرستی' کو جائز نہیں ٹھہراتا چاہے وہ 'مسلم قوم پرستی' ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بعد از تقسیم 'لیگ دشمنی' اور 'قیادت کشی' کے لئے خود بے تکلف مسلم قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا گیا اور نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے علمبردار اور پاکستانی قوم کے سب سے بڑے وکیل بن کر قومی قیادت کا محاسبہ شروع کر دیا گیا![1]

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے "تحریک جماعتِ اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ"

مولانا کی ذہانت نے یہ اندازہ تو ٹھیک ہی کیا تھا کہ مسلم لیگ کی دم توڑتی ہوئی قیادت پر کاری ضرب لگانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ لیکن آئندہ کے بارے میں جو توقعات انہوں نے قائم کی تھیں وہ نرے سہانے خواب ثابت ہوئیں اور قومی قیادت کے میدان سے ہٹنے پر بجائے اس کے کہ جماعت اسلامی کی "نئی" قیادت کے لئے جگہ خالی ہوتی الٹا "پرانا" یونینسٹ اور کانگرسی ذہن میدان سیاست پر قابض ہوگیا اور اس نظریہ پاکستان ہی کی جڑیں کھدنی شروع ہوگئیں جس پر بعد از تقسیم خود مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے اپنے سیاسی موقف کی بنیاد رکھ دی تھی ——— دوسری طرف تحریک مسلم لیگ نے وقتی طور پر قومی و ملی احساسات کا جو تھوڑا بہت رنگ عوامی طرز فکر پر چڑھا دیا تھا اس کے پھیکے پڑتے ہی خالص مفاد پرستی، کنبہ و قبیلہ پروری اور اقربا نوازی کا دور دورہ ہوگیا اور سیاست کے میدان میں بدترین جوڑ توڑ اور سازشوں کا بازار گرم ہوگیا۔

میدان سیاست کے اس اختلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر رفتہ رفتہ سروسز کے جانب منتقل ہوتی چلی گئی۔

تا آنکہ ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر فوجی حکومت قائم کردی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طرف حکومت کا پورا نظم ونسق سروسز کے حوالے کر دیا اور دوسری طرف بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سیاسی حقوق اور اختیارات کو تدریجاً عوام کے جانب منتقل کرنے کا وہی سلسلہ از سر نو شروع کیا جس پر تقریباً نصف صدی قبل غیر ملکی حکمران عمل پیرا ہوئے تھے ——— گویا پاکستان کی عوامی سیاست ایک دم واپس نصف صدی قبل کے مقام پر پہنچ گئی!

ملی اور قومی نقطہ نگاہ سے یہ صورت حال یقیناً نہایت تشویش ناک اور پریشان کن ہے اور ہر مخلص اور محب وطن پاکستانی کو لازماً اس پر سخت مضطرب اور غمگین ہونا چاہیئے لیکن اس حقیقت کو ہر آن پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس کا اصل سبب قوم میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی اور ملی و قومی احساسات کا خوفناک حد تک فقدان ہے! کسی ایک یا چند افراد کے سر اس پوری صورت حال کی ذمہ داری تھوپ دینا یا سیاسی بے بصیرتی کا شاہکار ہے یا علمی خیانت کا! ——— ساتھ ہی یہ موٹی سی بات بھی ہر مخلص پاکستانی کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اس کا علاج نہ صدارتی اور پارلیمانی جمہوریت یا بلاواسطہ و بالواسطہ انتخابات کے مسئلوں پر وقتی ہنگامے اٹھانے سے ہوسکتا ہے۔ نہ مینڈکوں کی پنسیری کی طرح کے بالکل انمل بے جوڑ متحدہ محاذوں کے قیام سے ——— ! اس صورت حال کی اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ بالکل فطری طریق پر عوام میں سے کوئی سیاسی جماعت ایسی اٹھے جو مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جدوجہد کے ذریعے

ایک طرف ان میں سیاسی شعور اور اپنے بھلے اور بُرے کی حقیقی پہچان پیدا کرے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ایسے قومی کارکنوں کو تربیت دے کر تیار کرے جو ہر طرح کے مفادات سے صرفِ نظر کر کے خالص اصولوں کے لئے کام کر سکیں اور اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور قوم کی بہتری اور بھلائی کے لئے انتھک محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

۱۹۵۱ء میں جب کہ مرحوم مسلم لیگ ابھی موت اور زندگی کی کش مکش ہی میں مبتلا تھی۔ سابق صوبہ پنجاب کے انتخابات میں مولانا مودودی بڑی خود اعتمادی اور آن بان کے ساتھ اور بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ کر کے انتہائی بلند و بالا اصولوں کے تحت شریک ہوئے ——— اور اگرچہ اس موقع پر اس 'قوم' نے جس کی سرپرستی انہوں نے محض ازراہِ نوازش اپنے سابقہ موقف کے سارے تانے بانے کی قربانی دے کر اختیار کی تھی، انہیں ایک ایسی دولتی رسید کی جس سے کم از کم ایک بار تو قیادت و سیادت کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تاہم اس اصول کے تحت کہ ع

"پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!"

وہ اپنے اصولوں میں مسلسل کانٹ چھانٹ اور طریق کار میں متواتر کتر بیونت کر کے انتخابات میں شریک ہوتے رہے لیکن نتیجہ ہر بار الٹا ہی نکلا اور مسند حکومت و اقتدار "نظراں توں نیڑے" ہونے کے باوجود روز بروز "قدماں توں دور" ہوتی چلی گئی[1]۔

---

[1] جماعت اسلامی کے حلقے کے پنجابی کے مشہور شاعر عبداللہ شاکر نے انتخابات پنجاب ۱۹۵۱ء کے موقع پر ایک نظم کہی تھی جو مرحوم 'تسنیم' کے انتخابات نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کو ہدف طنز و استہزاء بنا کر ان کی شان میں بار بار یہ شعر دہرایا گیا تھا کہ ؎

وزارت پنجابے والی لیلیٰ ضرور ہے
نظراں تو نیڑے قدماں تو دور ہے!

محض یہ ایک شعر اس بچگانہ خود اعتمادی کی پوری تصویر کشی کر دیتا ہے جو اس وقت جماعتِ اسلامی کے پورے حلقے پر طاری تھی ——— یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ع

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!"

چنانچہ انتخابات کے بعد میاں صاحب موصوف ہی وزارت علیا کے منصب پر فائز ہوئے۔ اور جماعت جہاں تھی وہیں رہ گئی۔

تاہم درمیانی عرصے میں جب پاکستان کی سیاست کا میدان مسلسل اکھاڑ پچھاڑ اور ری پبلکن پارٹی، عوامی لیگ اور دوسرے بے شمار نئے اور پرانے سیاسی دھڑوں کی رسہ کشی اور جوڑ توڑ کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آئے دن حکومتیں بن اور بگڑ رہی تھیں اور پوری پاکستانی قوم کی تقدیریں صبح و شام بدل رہی تھیں۔ دھندلی سی ایک امید اس بات کی قائم تھی کہ تلزم سیاست کے کسی اتار چڑھاؤ اور مد و جزر کے دوران کیا عجب کہ اتفاقی واقعات و حوادث کا کوئی ریلا دینی اسلامی قیادت کی ایک بار ایوانِ حکومت تک رسائی کی صورت پیدا کر دے۔ پھر اپنی تنظیمی قوت کے بل پر مزید ترقی و استحکام کی صورتیں پیدا کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا ——— چنانچہ اس زمانے میں اپنی ایک تحریر میں مولانا مودودی نے افتراق و انتشار کے "شگاف" کو "خیر کی راہ" قرار دیا اور اپنے کچھ مایوس معتقدین کی ہمت یہ کہہ کر باندھنے کی کوشش کی :-

"حقیقت میں یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان لوگوں کے دلوں میں نفاق ڈال کر انہیں آپس میں لڑا دیا ہے۔ خیر کی راہ اب تک اسی شگاف سے نکلی ہے اور آئندہ بھی یہ شگاف جتنا وسیع ہوتا جائے گا خیر کا راستہ بھی کشادہ ہوتا چلا جائے گا . . . ."

(ترجمان القرآن، مئی ۵۶ء : اشارات)

اس اعتبار سے ۵۸ء کا انقلاب "خیر کی جملہ راہوں" کو ایک بارگی مسدود کرنے کا سبب بن گیا اور دورِ افق پر امید کی جو کرن نظر آیا کرتی تھی دفعتہً وہ بھی معدوم ہو گئی ——— !!

میدان سیاست کی ان پے در پے ناکامیوں سے مولانا مودودی پر شکست خوردہ ذہنیت اور رقیبانہ جذبات کا تسلط ہوتا چلا گیا اور نہ صرف ان کے اور ان کی جماعت کے بلکہ ان کے زیر اثر ایک بہت بڑے حلقے کے لوگوں کے اعصاب میں دائمی جھنجلاہٹ اور فکر و نظر میں مستقل کجی پیدا ہوتی چلی گئی۔ نتیجتہً قوم کے طبقۂ متوسط کے ایک بہت بڑے حلقے کے لوگوں کا حال یہ ہو گیا کہ ایک طرف تو توازن و استحکام کی حالت میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے اور ملک کے طول و عرض سے کسی بھی قسم کے انتشار و اختلال کی خبر سے ان کے دل کی کلی کھل اٹھتی ہے اور دوسری طرف ہر وہ شخص جو کسی وقت کسی لیلائے اقتدار سے ہم آغوش ہو سراپا برائی اور مجسم شر ہی نہیں بلکہ تمام خرابیوں کا منبع اور ملک و ملت کے سارے مسائل اور تمام مشکلات کا واحد سبب نظر آنے لگتا ہے اور جو کسی بھی ٹوٹی پھوٹی حزبِ مخالف سے تعلق رکھتا ہو قطع نظر اس سے کہ وہ خود ان کے نقطۂ نظر سے ملک و ملت اور مذہب و دین دونوں کے لئے کتنی ہی مضرِ مہلک ہو وہ خیر کلی نہ سہی جزوی خیر بہرحال بن جاتا ہے ——— ! یہی وہ طرزِ فکر ہے جس کے تحت مولانا مودودی ایسے بظاہر ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک اور متحمل مزاج و بردبار انسان کے منہ سے ایسے غیر متوازن جملے

نکلتے ہیں کہ: "ایک طرف ایک مرد ہے جس میں سوائے اس کے کہ وہ مرد ہے اور کوئی خوبی نہیں اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں سوائے اس کے کہ وہ عورت ہے اور کوئی عیب نہیں ——— !" یا یہ کہ کنونشن لیگ کی جانب سے اگر کوئی فرشتہ بھی انتخابات میں کھڑا ہوگا تو ہم اس کی بھی مخالفت کریں گے!" وغیرہ وغیرہ ...

> جذبۂ رقابت کی یہ فراوانی ——— بلکہ طغیانی اس صورت میں بھی مضر ہوتی اگر مولانا صرف ایک سیاسی لیڈر ہوتے۔ لیکن ان کی اس حیثیت نے کہ وہ ایک دینی جماعت کے سربراہِ اعلیٰ اور خصوصاً سیاست کے میدان میں اسلام کے تنہا اجارہ دار بھی ہیں۔ اس صورتِ حال کو اسلام کے لئے سخت خطرناک بناکر رکھ دیا ہے !!

جس کی سنگینی میں مزید اضافہ اس امر سے ہوگیا ہے کہ اگرچہ ادھر ایک عرصے سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا کوئی باقاعدہ ربط وضبط علما کے ساتھ نہیں ہے اور اب غالباً وہ اپنے سیاسی حوصلوں کی تکمیل کے لئے علماء سے اتحاد کو کوئی اہمیت بھی نہیں دیتے بلکہ اس کے برعکس ایک عرصے سے ان کی ساری نشست و برخاست ان خالص سیاسی لوگوں کے ساتھ ہے جن کی ایک عظیم اکثریت کو (اِلّاماشاءاللہ) دین و مذہب سے عملی لگاؤ تو دور رہا کوئی لفظی و قولی مناسبت بھی نہیں ہے ——— تاہم یہ ایک امر واقعی ہے کہ ایک طرف مولانا اور جماعتِ اسلامی علماءِ کرام کی جدید تعلیم یافتہ طبقے اور خصوصاً اس کی مغرب پرستانہ ثقافت اور طرزِ بود و باش سے بیزاری کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف علماءِ کرام بھی خالص دینی اعتبار سے خود مولانا سے شدید بیزار ہونے اور ان کے بعض نظریات کو شدید نوعیت کی ضلالت و گمراہی سمجھنے کے باوجود سیاسی میدان میں ان کے مذہبی رول کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں ——— بلکہ ان کے ایک طبقے نے تو گویا اس معاملے میں جماعت اسلامی کی بے ضابطہ قیادت کو عملاً قبول کرلیا ہے ——— اس طرح اگرچہ اس وقت کوئی باقاعدہ مذہبی کیمپ یا دینی محاذ تو موجود نہیں ہے تاہم مختلف دینی حلقوں اور مذہبی طبقوں کے مابین اتحاد و اتفاق کے مظاہرے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں[1] جو اس اعتبار سے تو بہت خوش آئند نظر آتے ہیں کہ ان میں اتحاد و اتفاق کی جھلک نظر آتی ہے لیکن چونکہ اس اتحاد کی بنیاد کسی مثبت تعمیری جذبے کے بجائے خالص منفی طرزِ فکر پر

---

[1] مثلاً ایک عیدالفطر ۱۹۶۷ء کے موقع پر اور دوسرے ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف

ہے لہٰذا درحقیقت اسلام اور پاکستان میں اس کے مستقبل کے نقطہ نظر سے نہ صرف یہ کہ اس میں افادیت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ الٹا مضرت و نقصان کا شدید احتمال موجود ہے! اور یہ بات ہر اس شخص کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے جو پاکستان میں اسلام کے مستقبل سے مخلصانہ دلچسپی رکھتا ہو کہ علمائے کرام کے ایک طبقے کا عمومی عدم اطمینان اور منفی طرزِ عمل اور جماعت اسلامی کی مستقل رقیبانہ جذبات کے ساتھ سیاست کے میدان میں اسلام کی 'سرپرستی' سے اس ملک میں اسلام کا مستقبل مخدوش ہوتا چلا جا رہا ہے!

(میثاق مئی ۱۹۶۷ء)

جماعت اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ، جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

"تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ"

تالیف: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ایم بی بی ایس (پنجاب) ایم اے اسلامیات (کراچی)

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیۃ طلبا و امیر جماعت اسلامی ساہیوال

ضخامت ۲۳۶ صفحات، سائز بڑا، طباعت آفسٹ

مجلد مع گرد پوش: قیمت چار روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

دارالاشاعت الاسلامیہ اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

کچھ تلخ مگر سنگین حقائق

"رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے!"

واقعات و حقائق کا صحیح ادراک و شعور صحیح طرزِ عمل کے لئے بمنزلہ اساس اور درست سمت میں اقدام کے لئے ناگزیر ولابدی ہے۔ پاکستان کا اسلام کے نام پر حاصل کیا جانا چاہے کیسے ہی عظیم مسلّمات میں سے ہو، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل اور ناقابلِ تردید ہے کہ یہ ان مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہوا ہے جو بقول مولانا مودودی "صدیوں کے توارث کی بدولت" ایک قوم بن گئے ہیں اور جن کی قومیت کی اساس اگرچہ اسلام ہی پر ہے لیکن خود اسلام سے ان کا رشتہ وتعلق محض نسلاً متوارث ہونے والے 'مذہب' سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور جن کی اخلاقی حالت کے بارے میں یہ رائے کہ :-

"..... یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اُسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے ذمائم اخلاق میں یہ کسی سے کم نہیں ہے ....."[1]

جتنی آج سے تیس سال قبل درست تھی نہ صرف یہ کہ اتنی ہی بلکہ شومیٔ قسمت سے اس سے بھی کہیں زیادہ آج صحیح ہے!

دین کے ساتھ اس کے حقیقی لگاؤ کا جائزہ لینا ہو تو اولاً عوام کو دیکھئے کہ ان کی ایک عظیم اکثریت اس سے ایک سطحی سی محبت رکھنے کے سوا نہ اس سے کوئی ذہنی مناسبت رکھتی نہ عملی تعلق۔ یہی

[1] مولانا مودودی : مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم

وجہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے محضر ناموں پر دستخط کرنے کے لئے تو یہ ہر وقت تیار ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے ذاتی یا گروہی مفادات کا معاملہ آجائے تو اسلام کے بڑے سے بڑے احکام کو پس پشت ڈال دینا اور اس کی تمام حدود کو پھلانگ جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

پھر چونکہ اس ملک کی سیاسی قوت کا سرچشمہ بہرصورت یہی عوام ہیں لہٰذا سیاست کے میدان میں اسلام کا نام خواہ کتنا بھی لیا جاتا ہو اور اس کے کیسے ہی بلند نعرے لگائے جاتے ہوں واقعہ یہ ہے کہ اصل سکہ یہاں یا خالص سیاسی مفاد کا چلتا ہے یا برادریوں اور قبیلوں کی اقتدار طلبی و رسہ کشی کا!

پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگوں کو دیکھئے جو کسی بھی اجتماعیت کا اصل قوام ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بنیادی اعتقادات سے ان کے قلوب و اذہان یکسر خالی ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی ایک بہت بڑی اکثریت مغرب کے مادہ پرستانہ الحاد کے نظریات و افکار پر پورا ایمان رکھتی ہے۔ ان میں سے جو جتنا ذہین ہے اتنا ہی مغربی فلسفہ و فکر سے متاثر ہے اور جو ذرا جری بھی ہے وہ اس کے برملا اعلان اور کھلم کھلا اعتراف میں کوئی باک بھی محسوس نہیں کرتا!

پھر چونکہ ان ہی میں سے ملک کی پوری انتظامی مشینری کے کل پرزے نکلتے ہیں اور ان سے نسبتاً ذہین تر افراد ہی سے ملک کے تمام فوجی و سول محکموں کا اصل تانا بانا بنتا ہے۔ لہٰذا فطری طور پر سروسز کا پورا ماحول (الا ماشاء اللہ) مغربی افکار و نظریات اور مادہ پرستانہ و ملحدانہ تہذیب و ثقافت سے تیار ہوا ہے اور فطری طور پر ان میں سے زیادہ جری اور نسبتاً "تناقض و نفاق" سے آزاد لوگ اسی ثقافت کی پورے ملک میں ترویج و اشاعت کی کھلم کھلا کوشش میں بھی مصروف ہیں!

ان لوگوں کو "مٹھی بھر" اور "گنتی کے چند لوگ" قرار دے کر ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش ایک سادہ سی خود فریبی ہے۔ اور اس سے یہ حقیقت مٹ نہیں جاتی کہ اس ملک کی 'ذہین اقلیت' (INTELLECTUAL MINORITY) بہرحال یہی ہیں اور ان ہی کے ہاتھ میں اس ملک کی اصل زمام کار ہے!

اور آگے چلئے ——— اور حقائق کا مواجہہ کرنے کی جرأت پیدا کر کے جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ مغربی افکار و نظریات کا یہ استیلاء خود ان لوگوں کی بھی اکثریت کے ذہنوں پر بتمام و کمال موجود ہے جو یہاں اسلام کے علمبردار اور اسلامی نظام کے قیام کے داعی ہیں۔ ان کی عملی زندگیوں کے عام نقشے اور قول و فعل کے تضاد کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان کے تصور دین کا بنظر غائر مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود مذہب کا ایک خالص لادینی تصور ان کے ذہنوں میں قائم ہے اور اسلام ان کے نزدیک "ایک

بہترین ضابطہ حیات" اور "حیات دنیوی کے مسائل کے بہترین حل" سے زیادہ اور کچھ نہیں! حقیقت دینی اور روح ایمانی سے ان کی ایک بہت بڑی اکثریت تہی دست محض ہے اور اسلام کے بنیادی اعتقادات کو ماننا ان کے نزدیک دراصل صرف کچھ سماجی و تمدنی ضرورتوں کی بنا پر ہے! ان کی حقیقت کا ادراک تو بہت دور کی بات ہے۔ اس کی کسی ضرورت کا احساس تک ان کو حاصل نہیں۔ دین جس زندگی کو اصل حیات قرار دیتا ہے اس کی اہمیت ان کے نزدیک ایک تتمے سے زیادہ نہیں اور حیاتِ دنیوی، جس کی دین میں کوئی وقعت نہیں وہ ان کے غور و فکر کا اصل موضوع اور ان کی سعی و جہد کا اصل محور ہے! حتیٰ کہ جو چیزیں دین میں 'عماد' کا درجہ رکھتی ہیں ان سے بھی ان کا تشغف بس واجبی سا ہے ——— اور وہ بھی بابد و شاید ——— حد یہ ہے کہ ایک بہت ثقہ راوی کی روایت کے مطابق ایک بہت بڑے داعیِ دین اور علمبردارِ اسلام کے نزدیک :-

اسلام دراصل ایک سیاسی و تمدنی نظام (POLITICO - SOCIAL SYSTEM) ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے ۔۔۔۔ !"

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ! ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا کارِ طفلاں تمام خواہد شد!![1]

اور آگے بڑھیے ——— مذہبیت کا ایک عمومی ڈھانچہ جن لوگوں کے دم سے قائم ہے وہ اکثر و بیشتر تجارت پیشہ طبقے کے کچھ مذہبی لوگ ہیں جو مسجدیں تعمیر کرتے اور انہیں آباد کرتے ہیں مدارس قائم کرتے اور انہیں چلاتے ہیں اور مساجد و مدارس کے اہتمام و انتظام کا سارا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ ان میں سے جو زیادہ دیندار ہوتے ہیں وہ خود نمازیں پڑھتے، زکوٰۃ دیتے اور حج کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ذرا قریب ہو کر دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک بہت بڑی اکثریت کے یہاں آمد و خرچ کے معاملے میں حلال و حرام کی تمیز یکسر ختم ہو چکی ہے۔ سودی کاروبار رفتہ رفتہ "عرفاً" ہوتا ہے۔ اور جھوٹ سچ کا کوئی فرق کاروبار میں نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ ایک صوفی منش بزرگ نے پچھلے دنوں بڑے گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا کہ ——— "پورے پاکستان میں شاید کوئی ایک مسجد بھی ایسی نہ مل سکے جو خالص حلال ذرائع سے کمائے ہوئے روپے سے تعمیر کی گئی ہو!" ——— اس پر مستزاد یہ کہ ان مساجد و مدارس میں چودھراہٹ کے حصول اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے جس قسم کے جوڑ توڑ

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے راقم الحروف کا رسالہ "اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام"

ہوتے ہیں اور جو سازشیں کی جاتی ہیں ان کے سامنے میدانِ سیاست کے جوڑ توڑ بھی شرما کر رہ جائیں۔

علما کے طبقے کو دیکھئے ——— تو اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دین جیسا کچھ اور جتنا کچھ آج موجود ہے وہ انہی کے دم سے اور انہی کی کوششوں کی بدولت ہے ——— اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس حلقے میں کہیں کہیں علم و عرفان کی مشعلیں بھی روشن ہیں اور ایمان و ایقان کی مشعلیں بھی ——— اور ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اصحاب علم بھی ہیں اور ارباب عمل بھی، جن کی گفتار قلوب میں گداز پیدا کرنے والی اور کردار لوگوں کے لئے عزیمت کا سامان مہیا کرنے والا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اور علما کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ نہ دلوں میں ایمان کی شمع ایسی روشن ہے کہ ماحول کو منور کر سکے ——— نہ اخلاق و اعمال اس درجے کے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر سکیں۔ تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس ان کی ایک بڑی اکثریت کا پیشہ بن کر رہ گیا ہے اور بڑے بڑے دارالعلوموں میں یہ افسوس ناک اور تکلیف دہ صورت حال نظر آتی ہے کہ بیشہ ورانہ چشمک اور رقابت و حسد ——— اور آپس کے جھگڑوں اور منافقتوں کے اعتبار سے وہ خالص دنیا دار اداروں سے کسی طرح مختلف نہیں!

رہی یہ کمی کہ ان کی ایک بڑی اکثریت موجودہ دنیا کے علوم و فنون سے بیگانہ محض ہے۔ تو اس کا ذکر تحصیل حاصل ہے! اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علماء کا اثر معاشرے کے طبقہ متوسط کے بھی صرف نصفِ ادنیٰ تک ہی پہنچ پاتا ہے اور موجودہ معاشرے میں ان کی حیثیت زندگی کی اصل منجھدار سے کٹی ہوئی ایک علیحدہ شاخ سے زیادہ کچھ نہیں!

ان تلخ حقائق کو پیش نظر رکھ کر خدارا سوچئے کہ کیا محض اس دلیل سے کہ "پاکستان اسلام کے نام پہ حاصل کیا گیا تھا!" یہاں اسلام قائم ہو جائے گا یا سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ لگانے سے اسلامی انقلاب برپا ہو جائے گا؟ یا محض عوام کے مذہبی جذبات کے اشتعال سے مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار رک جائے گی؟ یا محض منفی مدافعت و مخالفت سے دین میں تحریف کا سلسلہ ختم ہو جائے گا؟ ——— اپنے اس طرزِ عمل کے لئے لاکھ دلائل پیش کر دیجئے، سینکڑوں خوش نما تاویلات گھڑ لیجئے ——— صورتِ واقعہ یہ ہے کہ آج بیس سال سے ایک فعّال مذہبی و سیاسی جماعت اور طبقہ علماء کے سیاسی مزاج بزرگ اس طریق پہ عمل پیرا ہیں۔ لیکن حالات ہیں کہ روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بزعمِ خویش کوئی کتنا ہی الحاد و بے دینی اور فحاشی و بے حیائی کے سیلاب کے آگے بند بنا کھڑا ہو واقعہ یہ ہے کہ نہ الحاد و بے دینی کے سیلاب میں

کوئی کمی آئی ہے نہ فحاشی و بے حیائی کے ــــــ الٹا اس فعال دینی جماعت کا جو سیاست کے میدان میں مذہب کی علمبردار بن کر اتری تھی یہ حشر ضرور دیکھنے میں آیا کہ رفتہ رفتہ اس کی مذہبیت تو تحلیل ہو کر ختم ہوتی چلی گئی اور نری سیاست باقی رہ گئی۔ تا آنکہ اب اس کے نزدیک پاکستان میں اسلام کے مستقبل کا سارا دار و مدار اس پر رہ گیا ہے کہ یہاں انتخابات بلا واسطہ ہوں اور پارلیمانی جمہوریت کا نظام بحال کر دیا جائے ــــــ فاعتبروا یا اولی الابصار!

ہماری قومی زندگی کا دھارا پورے زور شور سے ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے۔ اور تا حال مذہبی طاقتیں اس پر کسی قسم کا کوئی اثر ڈالنے اور اس کے رخ کو تبدیل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ دوسری طرف ملکی حکومت کو ہر آن نئی مشکلات و مسائل کا سامنا ہے اور بین الاقوامی سیاست کے بدلتے ہوئے رنگ اور بڑی طاقتوں کی بدلتی ہوئی حکمت عملی سے صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کو اپنی سالمیت کے تحفظ کے لئے بڑی کٹھن مشقت و ریاضت کرنی ہوگی اور بڑے نامساعد حالات سے گذرنا ہوگا۔ ان حالات میں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ اگر مذہبی حلقوں کی نری سیاسی نعرہ بازی اور محض منفی مدافعت و مخالفت کی حالیہ روش برقرار رہی اور کوئی زیادہ مثبت دینی دعوت ایسی نہ اٹھی جو ذہنوں کو مفتوح اور قلوب کو مسخر کر سکے تو کسی مشکل وقت میں اعصاب کا تناؤ ایسی صورت پیدا نہ کر دے کہ پھر اسلام کا نام لینا بھی مشکل ہو جائے ــــــ!

اسی اہم خطرے کی نشان دہی کے لئے ہم نے یہ طویل معروضات پیش خدمت کی ہیں۔ اور تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر موجودہ صورت حال کا تجزیہ کیا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ اس سے ہمارا مقصد نہ کسی کی دل آزاری ہے نہ توہین و تنقیص، البتہ کچھ "تلخ حقائق" کا مشاہدہ بعض اوقات "تلخ نوائی" پر منتج ہو ہی جاتا ہے۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ اس پر ہمیں معذور سمجھا جائے اور ہماری گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔　　اقول قولی ھذا واستغفر اللہ ربی العلمین ○

(میثاق، مئی ۱۹۶۷ء)

ماننج اپریل اور مئی ۱۹۶۷ء کے ان اداریوں کے بعد 'میثاق' جون ۱۹۶۷ء میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے ذیل میں جو تحریر شائع ہوئی تھی وہ اب "اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام!" کے نام سے کتابی شکل میں مطبوعہ موجود ہے ــــــ!

غزل

پروفیسر محمد منورؒ

"کہ رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شد"[۱]

پروفیسر مرزا محمد منورؒ (گورنمنٹ کالج لاہور) استاذ تو اردو کے ہیں لیکن انہیں اردو سے کہیں زیادہ شغف فارسی اور عربی سے ہے۔ غالباً فارسی زبان میں ڈگری تو کوئی نہیں لی لیکن سب سے زیادہ دلچسپی فارسی ادب ہی سے رکھتے ہیں۔ ایم اے" اردو اور عربی کے علاوہ فلسفہ میں بھی کیا ہے —— اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ اسلامی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عربی کی متعدد قدیم کتب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ علمی و ادبی موضوعات پر ان کے مقالات علمی جرائد میں اور سیاسی تبصرے اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ دلِ دردمند اور دیدۂ پُرنم کے مالک ہیں —— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جذبۂ ملی سے سرشار ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں نہایت فکرمند رہتے ہیں۔

آج سے تقریباً چار سال قبل راقم الحروف کی ملاقات ان سے ہوئی تو اس نے اپنا یہ تاثر ایک جگہ بیان کیا کہ —— "بہت عرصہ بعد ایک مخلص مسلم لیگی سے ملاقات ہوئی!" تحریکِ پاکستان کا فدائی اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال اور بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کا شیدائی اگر اس دور میں دیکھنا ہو تو بس ان سے مل لینا کافی ہے۔ چنانچہ فرطِ ادب سے ان دونوں کا نام تک زبان پر نہیں لاتے بلکہ صرف حضرتِ علامہ اور حضرتِ قائداعظم پر اکتفا کرتے ہیں۔

بایں ہمہ —— احیائے اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کا جو خواب کبھی پاکستان کی صورت میں دیکھا تھا اس کی موجودہ تعبیر سے سخت دل شکستہ ہیں اور ان کی اسی دل شکستگی کی مظہر درج ذیل غزل ہے —— اتفاق سے 'میثاق' کے صفحات میں ان دنوں جو موضوعات زیرِ بحث ہیں انہی کا ایک عکس اس غزل میں بھی موجود ہے جسے ہم مرزا صاحب کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں —— اسرار احمد

میانِ کفر و ایماں عاشقانِ را کارواں گم شد
نیامد خوش ہوائے کعبہ و کوئے بتاں گم شد

نمی داریم غم گر ذوقِ اظہارِ بیاں گم شُد!
که ما فریاد ہا کردیم و در گوشِ گراں گم شُد

نہ مارا رازداں باقی و نَے رازِ نہاں باقی!
که رازِ ما بہرکس فاش کردو رازداں گم شُد!

ہمیں بودہ است عالم عزمِ کارو رنگِ ساماں را!
که دستے بر خدنگ افتادو از دستے کماں گم شُد!

چہ دارد سعیٔ ما سودے نمی یا بیم مقصودے
که برگ وخس بیا وردیم و شاخِ آشیاں گم شُد!

خنک روزے بود یا بیم اگر خضرِ ہدایت را
که رہوارِ یقینِ ما بہ صحرائے گماں گم شُد!

ہماں آویختہ مانیم آں سوئے نہ ایں سوئے!
زمیں از زیرِ پا بر رفت و از سر آسماں گم شُد!

نگارِ آرزو شُد نذرِ افکارِ پریشانم
"متاعِ کارواں اندر غبارِ کارواں گم شُد!"

بہ بخشائی گرانجانی ما بارِ دگر یارب!!!
زمامِ کارِ ما از دستِ ما آشفتگاں گم شُد

لہ غزل کا ذہنی پس منظر سیاسی ہے۔ برِّ عظیم تقسیم ہوا۔ بڑی نیک خواہشات کے ساتھ مسلم قوم نے تقسیم کی تحریک کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ مگر بوجوہ نتائج حسبِ تمنا برآمد نہ ہوتے ما جب بھی کوئی بہتری کی صورت پیدا ہوتی ساتھ ہی ساتھ کوئی خرابی بھی در آتی۔ اے کاش قائد اعظم کی طرح کا کوئی "مردِ امین" پھر مل جاتا۔ منوّر

افاداتِ فراہیؒ
ترجمہ : خالد مسعود

دین کا نظام

حکمت کی بنیاد وجود کے مختلف اجزا کے مابین موافقت کے جاننے پر ہے۔ یہ جاننا اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اس کے تمام اجزا کی حیثیت ایک نظام کے اندر متعین کر کے نظامِ کائنات کی معرفت حاصل نہ کر لی جائے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے جملہ کے ہر جزو کے موقع و محل اور ان کی آپس میں نسبت کو جانے بغیر جملہ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے اور صرف الفاظ کے معانی کا علم مفہوم سمجھنے میں کسی کام نہیں آتا جب تک مکمل جملہ کو نہ سمجھ لیا جائے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر جملہ کے صحیح معانی معلوم نہ ہو سکیں تو مفرد الفاظ کے معنی متعین کرنے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک حکیم کے لئے جملہ کائنات کے نظام اور اس کی وحدت کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ عالم کو عابد پر فضیلت حاصل ہے اگرچہ اس کی عبادت میں کوئی ظاہری خلل اور نقص نہ ہو تو یہیں سے اس کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ عابد فرائض و سنن اور اوامر و نواہی کے جاننے میں عالم کا محتاج ہوتا ہے۔ اس علم کے بغیر تو عبادت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عابد ظاہری احکام کا عالم ہوتا ہے وہ دین کے حقائق کا عالم نہیں ہوتا۔ وہ اپنے رب کی عبادت بالکل اسی طرح کرتا ہے جس طرح کسی بھی مذہب کا پیرو کرتا ہے۔ معاملات و اعمال میں بھی اسے حسنِ ظن حاصل نہیں ہوتا۔ خدا سے وہ کچھ مانگ بیٹھتا ہے جس کا مانگنا مناسب نہیں ہوتا۔ خدا سے اسے وہ گمان ہوتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔ پس عالم کی عابد پر فوقیت اس بنا پر ہوتی ہے کہ عالم کی نظر دین کے حقائق پر ہوتی ہے اور وہ دین کے نظام سے واقف ہوتا ہے۔ عابد کو یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ دین کی حکمت سے واقف ہونے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

کائنات میں نظام صرف ایک ہے۔ یہاں جو تضاد نظر آتا ہے وہ یا تو کوئی اچھا نتیجہ برآمد کرنے کے

سے ہے یا اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی نگاہ اس حقیقت پر نہیں ہوتی کہ اس کائنات میں اشیا جوڑا جوڑا ہیں لہٰذا یہاں کے شر اور فساد کو ایک خاص اعتبار سے دیکھنا چاہیئے۔ قرآن نے متعدد مواقع پر اضداد گنوائی ہیں اور ان کا جوڑے جوڑے ہونا واضح کیا ہے۔ یوں بھی ہر صاحب حکمت اپنے ہر کام میں نفع اور خیر ہی کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو قدیم زمانے سے لوگ سمجھتے رہے ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں۔ مثلاً حافظ کہتے ہیں

بنیست در دائرہ یک نقطہ خلاف از کم و بیش

کہ من ایں مسئلہ بے چون و چرا می بینم

اس بنیاد پر اب مذاہب کے معاملے پر غور کیجیے۔ اگر مذہب صحیح ہو تو لازم ہے کہ اس میں ایک صحیح نظام موجود ہو یعنی اس کے عقائد اور اعمال میں موافقت ہو۔ اس کے اور فطرت انسانی کے درمیان مغائرت نہ ہو۔ اس کے اور کائنات و مخلوق کے درمیان کامل ہم آہنگی ہو۔ اگر یہ شرائط پوری ہو جائیں تو ایسا مذہب حکیمانہ، فطری اور رب رحیم و کریم کے رستے پر سیدھا قائم رکھنے والا ہوگا۔ جو شخص اس کی حکمت سے واقف ہو کر اس کے مطابق رویہ اختیار کرے گا وہ نور و بصیرت پر ہوگا۔

اب ہم یہ بحث کریں گے کہ دین اسلام کی ہیئت کلیہ کیا ہے، خارج کے ساتھ اس کی نسبت کیا ہے۔ اس کے داخلی اجزا میں باہم دگر کیا تعلق ہے، اس میں تقدیم و تاخیر کے مواقع کیا ہیں۔ تاکہ ہمیں اس کے اجزا کی آپس میں موافقت معلوم ہو اور مجموعی اعتبار سے ان کی موافقت خارج کے ساتھ پتہ چلے اور ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ حق اپنے اجزا میں ٹکراتا نہیں۔

لا ترى فى خلق الرحمٰن	تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی رخنہ نہ
من تفوت فارجع البصر	پائے گا۔ پس تو نگاہ دوڑا۔ کیا تو
هل ترى من فطور (ملک)	کوئی رخنہ پاتا ہے ؟

ہم اس بحث میں فطرت انسانی اور قرآن کی باہمی موافقت، خلق و امر کا تعلق اور خدائے عزیز و حکیم اور اشرف المخلوقات انسان کے درمیان رابطہ کو بھی واضح کریں گے اور نتیجۃً انسان اور دوسری مخلوقات کے باہمی تعلق کو بھی واضح کریں گے کیونکہ انسان کو عالم اکبر کہا گیا ہے۔

ہدایت اور فطرت

قرآن نے جس طرح اپنے بارے میں یہ تصریح کی ہے کہ وہی اصل ہدایت اور رب کے راستے اور دین قیم کی طرف رہنمائی دینے والی کتاب ہے۔ اسی طرح اس نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ اصل دین اسلام ہے اور یہی اصل فطرت بھی ہے: چنانچہ اس نے قرآن اور انسان کے اور تخلیق اور امر کے مابین کی موافقت کی عمومی وضاحت کی ہے۔ فرمایا:۔

اعطیٰ کل شیٔ خلقه	اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت
ثم ھدیٰ	بخشی پھر رہنمائی دی۔
الذی خلق فسوی والذی	جس نے پیدا کیا تو تسویہ کیا اور جس نے
قدّر فھدی	اندازہ ٹھہرایا اور ہدایت دی۔

تسویہ سے مراد یہ ہے کہ اس کے اجزا کا ایک دوسرے کی مناسبت کا لحاظ کر کے جوڑ ملایا گیا۔ تاکہ حقیقی غایت کے لئے اس کو استعمال کیا جا سکے۔ یہی مفہوم احسان الخلق کا اس آیت میں ہے جس میں فرمایا:

الذی احسن کل شیٔ خلقه	جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی

ان آیات میں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ جس نے پیدا کیا اسی نے ہدایت کا سامان بھی کیا۔ اور یہ دلیل بھی ہے کہ جس طرح خدا حکم دینے کا حق رکھتا ہے اسی طرح وہی ہے جو ہدایت بھی دے سکتا ہے اس مفہوم کو دوسری آیت میں واضح بھی کر دیا:

الا له الخلق والامر	جان رکھو خلق اور امر اسی کے لئے ہے

پس اگر ہدایت اس کی ٹھیرائی ہوئی فطرت کے موافق ہو تو یہ اس کی ہدایت اور اس کا راستہ اور اس کا ارادہ ہے۔ ہدیٰ کے لفظ میں یہ مفہوم ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق کسی نفع یا استعمال کے لئے کی ہے اسی طرح اس نفع یا مقصد کے حصول کی طرف اسے رہنمائی بھی دے دی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پھر انسان کو ہر چیز کی تفصیل سے واقف ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے اور دوسری اشیا کے درمیان نسبت کو سمجھ جائے۔ اسے مرتب کر کے ایک نظم میں پرو لے اور اس کی تفصیل سے اس قدر واقف ہو جائے جتنا اپنی خلقت کی غایت کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ کائنات کی دوسری اشیا کی مانند اس ہستی کے ارادہ کے مطابق زندگی گذار سکے جس کے قبضے میں تمام کائنات کی باگ ڈور ہے۔

اگر ایک شخص اس کے برعکس زندگی گذارے گا تو اس کی فطرت ناقص رہ جائے گی اور وہ خالق کی نافرمانی کرے گا۔ لیکن بہرحال نہ تو وہ اس کے مضبوط نظام سے نکل سکے گا اور نہ اس کے امر پر غلبہ پا سکے گا کیونکہ خدا نے جس طرح ہر معاملے کی تقدیر ٹھیرائی ہے اسی طرح اس کی تدبیر بھی خود کی ہے۔

چونکہ خدا نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ اور خیر و شر کی تمیز رکھنے والا بنایا ہے اس لئے اس نے ان میں سے کسی ایک پر اسے مجبور نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔ لیکن چونکہ اس نے اسے صاحب اختیار بنایا تھا اس لئے اگر وہ اسے مجبور کرتا تو اس کا پُرحکمت اور پُر رحمت ارادہ متناقض ہو جاتا اور جو آزادی اس نے انسان کو بخشی تھی اس کی نفی ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا غایت درجہ

قرب عطا کرنے کے لئے اسے آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ جب انسان اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اس کے رستے سے ہٹ جاتا ہے تو اپنی منتخب کردہ مشکل میں جا پڑتا ہے اور یہی خالق کا ارادہ بھی ہے۔

اس مسئلہ نے بہت سے لوگوں کو لڑکھڑا دیا ہے اور مذہب پر اس کے برے اثرات پڑے ہیں۔ ہم اس کی تفصیل تو آگے بیان کریں گے یہاں ایک مرتبہ پھر یہ اشارہ کئے دیتے ہیں کہ ایک حکیم کے لئے کائنات کی حقیقت کو سمجھنا اور اس کے نظام کلی کو دریافت کرنا کس قدر ضروری ہے۔

مقصود حیات

نفس کی سعی کی غایت یہ ہے کہ جو استعداد اسے دی گئی ہے اس کی تکمیل کرے اور جو مقصد اس کو بتایا گیا ہے اس تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ استعداد کی تکمیل سے مراد یہ ہے کہ وہ علم اور عمل کی دونوں قوتوں کو کمال تک پہنچائے اور فہم و اخلاق میں ترقی کرے۔ اس کے علم و فہم کا کمال یہ ہے کہ نور و ظلمت، حق و باطل اور ہدایت و گمراہی میں فرق کر سکے۔ اور اس کے عمل و اخلاق کا کمال یہ ہے کہ پستی کی طرف لے جانے والی طبیعت کی رغبتوں سے اپنے آپ کو بلند کرے اونچا اٹھانے والی روح کی رغبتوں کی طرف متوجہ ہو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی کرنے اور پستی کی طرف لے جانے والے فانی کاموں کو پائدار اور عروج بخشنے والے کاموں پر قربان کرنے کی صلاحیت دی ہے اسی طرح اس نے حق و باطل میں فرق کرنے کے لئے بھی انسان کو تیار کر دیا ہے۔ اسی لئے اس نے اسے سمع و بصر اور فواد کی قوتیں عطا کیں۔ پھر اس کے لئے روشنی نازل فرمائی۔ اس کی طرف رسول بھیجے اور اسے قابلیت دی کہ جو کچھ خدا اس کی طرف بھیجتا ہے اسے پہچان سکے۔ اگر خدا انسان کو اس کی فطرت کے لحاظ سے تیار نہ کرتا تو اپنے پیغام کے قبول کرنے کا اس کو مکلف نہ ٹھہراتا۔

رہی یہ بات کہ خدا نے انسان کے لئے کیا مقصد متعین فرمایا ہے جسے حاصل کرنے کی اسے کوشش کرنی ہے تو وہ رب کی اطاعت اور اس حد تک اس کی رضا جوئی ہے کہ انسان اپنے رب کے لئے قربانی کے طور پر اپنے وجود کو بھی نظر انداز کر دے خواہ یہ بات اس کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔ جب بندہ اس معیار کو اپنا لیتا ہے اور اسی میں اپنی خوشی سمجھتا ہے تو اس کا رب بھی اس سے خوش ہو جاتا ہے۔ یوں تو خدا کی عبادت اس کی ہر مخلوق کرتی ہے لیکن انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی طبیعت کی ترکیب کے خلاف بھی اس کی عبادت کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی سعی اور محنت بہت بڑی اور کامل ہے۔ وہ اپنے رب کی امانت کا حق ایک ایسے رستے پر چل کر ادا کرتا ہے جو ڈاکوؤں، درندوں سے گھرا ہوا اور پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کے مواقع سے بھرا ہوا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ انسان اپنے وجود کی مخالفت کے باوجود خدا کی طرف مائل ہوتا اپنے نفس کو اپنا دشمن سمجھ لیتا اور اس کے ساتھ کشمکش کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس پر غلبہ پا کر وہ اسے قتل

کرکے اپنے مولا کے حضور ڈال دیتا ہے۔ اس تفصیل سے آیت امانت میں انه کان ظلوماً جهولاً کا مفہوم روشن ہوتا ہے یعنی یہ کہ انسان کی پستی کی طرف لے جانے والی طبیعت ہی اسے تقرب عطا کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ کوئی مجاہد مجاہد نہیں بن سکتا جب تک اس کا کوئی دشمن نہ ہو جس پر وہ غلبہ پا سکے۔ کوئی قربانی کرنے والا قربانی کرنے والا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاس ذبح کے لئے کچھ نہ ہو۔ یہاں قربانی آدمی کے نفس اور اس کی خواہشات کی ہوتی ہے۔ پس انسان کے مقام کے مانند کسی دوسری مخلوق کا مقام نہیں۔ اس کے قدم کے مانند کسی کا قدم نہیں۔ پس فہم و اختیار میں آزادی دے کر انسان کو آزمائش میں ڈالنا گویا ایسا ہے جیسے نفس کی تخلیق کے بعد خدا نے اسے اپنی طرف اٹھانے اور عروج بخشنے کے لئے ایک زینہ مہیا کر دیا۔

دین کی اساس — عبادت

امتوں کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دین کی اساس پروردگار کی عبادت اور اطاعت ہے اس اصل پر متفق ہونے کے بعد اس کی تفصیل میں مختلف امتوں کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ انہوں نے دین کے ساتھ ظن اور خواہشات کو بھی خلط ملط کر دیا ہے۔ لہذا اہم ترین کام عبادت کی اصلیت سے واقف ہونا ہے۔ صحیح عبادت مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے :

ا : پروردگار کے لئے اخلاص —— یہ توحید کے ذریعے آتا ہے جیسا کہ قرآن نے کثرت سے اس کی تصریح کی ہے۔ اس میں ان تمام علمی و عملی کجیوں کی نفی شامل ہے جو عقیدہ توحید کو خراب کرتی ہیں۔ ان کی تفصیل بہت طویل ہے جسے قرآن نے اچھی طرح واضح کیا ہے۔

ب : عبادت کے مغز کی معرفت —— عبادت کا مغز رب کی طرف رجوع کرنا، خوشی کے ساتھ اس کے ارادہ کی موافقت کرنا، اس کے آگے عاجزی کرنا اور اس سے حسن ظن رکھنا ہے اس کی شیرازہ بندی نماز اور قربانی سے ہوتی ہے اسی لئے کوئی دین نماز اور قربانی سے کبھی خالی نہیں رہا۔ یہ ضروری ہے کہ نماز اور قربانی اخلاص اور عاجزی کے ساتھ ہو۔ نماز کی تو ظاہری شکل ہی سے یہ دونوں باتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ رہی قربانی تو یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ قربانی کرنے والا یہ جانتا ہوتا ہے کہ اس کا رب اس کی قربانی سے بالکل بے نیاز ہے۔ پس وہ اسے حقیر سمجھتا ہے اور ڈرتا ہے کہ اگر فروتنی اور عاجزی سے اسے سرانجام نہ دے گا اور اس کا مقصد خدا کی رضا نہ سمجھے گا تو خدا اسے قبول نہ کرے گا۔ قرآن نے اس مضمون کو بھی ایک سے زیادہ آیات میں بیان کیا ہے۔

ج : اس کے بعد عبادت ان کاموں سے عبارت ہے جو ایک بندہ خدا کی رضا کے لئے اختیار کرتا ہے۔

وہ خدا کے رستے کا طالب ہوتا ہے اور تقویٰ اور نیکی کے اعمال میں سرگرمی دکھاتا ہے جس حد تک اسے اس کی فطرت ہدایت دیتی ہے یا خدا کی تعلیم اس تک پہنچتی ہے۔ بندہ جو کام بھی کرتا یا چھوڑتا ہے اس میں اس کی کوشش اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ وہ خدا ہی سے اس کے رستے کی پہچان اور اس کی رضا کا اسی سے طلب گار ہوتا ہے۔ جس شخص کے اندر اخلاص، نماز اور زکوٰۃ درست ہوں لازم ہے کہ اس کے اعمال بھی درست ہوں۔ یہ تینوں چیزیں غایت درجہ موافقت اور ترتیب رکھتی ہیں اور دین کے اجزا کو جمع کرتی ہیں۔

یہ بات مخفی نہیں کہ ہر شے کی تکمیل اس کی ترکیب اور نظام سے ہوتی ہے اور یہی اس کا کمال اور اس کے حسن کی انتہا ہوتی ہے۔ یہ نظام دوسرے تمام اجزا کے وجود میں آنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے لہٰذا جب ایک بندہ میں اولاً اخلاص یعنی ایک خدا پہ ایمان۔ ثانیاً دعا اور نذروں کے ذریعے اس کی طرف انابت اور رجوع۔ ثالثاً تمام اعمال میں خدا کی رضا کا لحاظ حتیٰ کہ وہ اپنے نفس اور اس کی خواہشات کی غلامی سے نکل کر اپنے دین کو خدا کے لئے خالص کرلے۔ یہ تین خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر ان سب میں وہ میانہ روی کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے نہ کسی ایک جانب غلو اختیار کرتا ہے اور نہ کسی جانب کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ ان اجزا کی تکمیل کر لیتا ہے۔ یہ چیز اس کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ ان اجزا کی باہمی نسبت کو خوب سمجھتا ہو اور اپنے ارادے پر اس قدر غالب ہو کہ اس کا ارادہ اور اس کی رغبت اس کے علم کے مطابق ہو۔ اس صورت میں اس کی عقل اور دل، علم اور عمل، ظاہر اور باطن، خواہش اور عقل کے مابین کوئی اختلاف باقی نہ رہے گا۔ جب یہ چوتھی خصوصیت پہلی تین خصوصیتوں کے ساتھ ملے گی تو اس کی عبودیت کامل ہو جائے گی اور وہ ایک صاحب حکمت بندہ مومن بن جائے گا جس کا دین مضبوط اور جس کا راستہ سیدھا ہو گا۔ اور اس میں کوئی کجی نہ ہو گی۔

مذکورہ امور اگرچہ ظاہر ہیں تاہم ہم نے ان کا ذکر اس لئے کر دیا ہے کہ ان کے نظم اور ہر ایک کے موقع ومقام کی طرف متوجہ کریں تاکہ خدا کے دین میں حکمت کا مقام معلوم ہو سکے اور ان تمام آیات میں اجزا کا محل واضح ہو سکے جو اس نظام کی تعلیم کے لئے خدا نے اتاری ہیں۔ انہی آیتوں میں سے ایک آیت وہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بیان کرتی ہے :

یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم	وہ ان کو خدا کی آیات سناتا ہے ان کا تزکیہ
ویعلمھم الکتاب والحکمۃ	کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے

(جاری)

تدبر قرآن
مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ اعراف

(۴)

۱۰۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۹-۹۳

اب آگے وہی انذار کا مضمون، جو اوپر سے چلا آ رہا ہے، تاریخی دلائل سے واضح کیا گیا ہے اور عرب کی پچھلی قوموں میں سے ایک ایک کو لے کر دکھایا ہے کہ کس طرح اللہ نے ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا لیکن انہوں نے اقتدار پا کر ناشکری کی روش اختیار کی، زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا کیا، عدل و قسط کو درہم برہم کیا، بالآخر اللہ نے ان کے اندر اپنا رسول بھیجا جس نے ان کو توحید اور عدل و قسط کے قیام کی دعوت دی لیکن انہوں نے اپنے غرور اور گھمنڈ کے سبب سے نہ صرف یہ کہ رسول کی بات مانی نہیں بلکہ اس کے درپے آزار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس قوم کو تباہ کر دیا۔ قریش کو یہ ساری تاریخ سنانے سے مقصود یہ ہے کہ اب ان کا معاملہ بھی اسی عدالت میں ہے جس میں ان تمام قوموں کے مقدمے پیش ہو کر فیصل ہوئے اور وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر انہوں نے بھی وہی روش اختیار کی جو ان قوموں نے اختیار کی تو اس بے لاگ عدالت کا فیصلہ ان کے لیے کچھ مختلف ہو۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہے۔ خدا جب کسی قوم میں اپنا رسول بھیجتا ہے تو اس قوم کے لیے دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں یا تو وہ اصلاح قبول کرے یا ہلاکت، اس کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

یہ واضح رہے کہ آگے جن قوموں کی سرگزشتیں آ رہی ہیں اہل عرب ان سے واقف تھے لیکن یہ واقفیت دھندلی دھندلی مبہم روایات کی شکل میں تھی، خاص کر ان کا اخلاقی پہلو تو بالکل ہی مبہم تھا، قرآن نے یہ ابہام کا پردہ اٹھا کر تاریخ کو از سر نو زندہ کیا اور ان کو دعوت دی کہ کان کھول کر ان سرگزشتوں کو سنیں اور ان سے عبرت حاصل کریں۔ یہ دوسروں ہی کی حکایت نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کی اپنی حکایت بھی ہے۔ اس

روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے :۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۵۹ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۶۰ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۶۱ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۶۲ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۶۳ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۶۴ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۶۵ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۶۶ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۶۷ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۶۸ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۶۹ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۷۰ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۷۱ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۷۲ وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۷۳ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ

سُهُولِهَا قُصُورًا ۝ تَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا
فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ
اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُرْسَلٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ
قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ۝ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي
آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا
يَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ فَأَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۝ فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ
لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ ۝ وَلُوطًا
إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ
الْعَالَمِينَ ۝ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ
أَنْتُمْ قَوْمٌ مُسْرِفُونَ ۝ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ
مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۝ فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ
كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝ وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا
اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَوْفُوا
الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا
فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝
وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا
فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝ وَإِنْ كَانَ
طَائِفَةٌ مِنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَمْ يُؤْمِنُوا
فَاصْبِرُوا حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝ قَالَ
الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۚ قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ۝
قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ

مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ
عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ
الْفٰتِحِيْنَ ۝۸۹ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ
شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝۹۰ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۹۱ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ
اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۲ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ
يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ
كٰفِرِيْنَ ۝۹۳

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، اس نے ان کو دعوت دی کہ اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں۔ میں تم پہ ایک ہولناک دن کے عذاب کے تسلط سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ اس نے کہا، اے میرے ہم قومو، مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے بلکہ میں تمام عالم کے رب کا رسول ہوں، تمہیں اپنے رب کے پیام پہنچا رہا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی یاد دہانی تمہی میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے آئی تاکہ وہ تمہیں باخبر کرے اور تاکہ تم ڈرو اور تاکہ تم پہ رحم کیا جائے!۔ پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور جو لوگ کشتی میں اس کے ساتھ تھے ان کو تو نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ بے شک یہ اندھے لوگ تھے۔ ۵۹ - ۶۴

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی اور معبود نہیں، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟ اس کی قوم کے بڑوں نے، جنہوں نے کفر کیا، جواب دیا کہ ہم تو تم کو ایک کھلی ہوئی حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تم کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔ اس نے کہا اے میرے ہم قومو، مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں۔ تمہیں اپنے رب کے پیام پہنچا رہا ہوں اور تمہارا دیانت دار ناصح ہوں۔ کیا تمہیں یہ بات عجیب لگی کہ تمہارے پاس

تمہارے رب کی یاد دہانی تمہی میں سے ایک شخص کے واسطہ سے پہنچی تاکہ وہ تمہیں ہوشیار کرے۔ اور یاد کرو جب کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور جسمانی اعتبار سے تمہیں وسعت و کشادگی عطا فرمائی تو اللہ کی شانوں کو یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ ہی کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ بیٹھیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے؟ تو تم جس عذاب کی ہم کو دھمکی سنا رہے ہو اس کو لاؤ اگر تم سچے ہو۔ اس نے کہا تم پر تمہارے رب کی جانب سے ناپاکی اور قہر مسلط ہو چکے ہیں۔ کیا تم مجھ سے کچھ فرضی ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں، جن کی خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری! سو تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پس ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنے فضل سے نجات دی اور ان لوگوں کی ہم نے جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور یہ ایمان لانے والے لوگ نہیں تھے۔ ۶۵-۷۲

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میری ہم قومو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک واضح نشانی آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے کہ تمہارے لیے ایک نشانی ہو پس اس کو چھوڑو کہ یہ اللہ کی زمین میں چرے پھرے اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچاؤ ورنہ تمہیں ایک دردناک عذاب آ پکڑے گا۔ اور یاد کرو جب کہ خدا نے قوم عاد کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور ملک میں تم کو تمکن بخشا، تم اس کے میدانوں میں محل تعمیر کرتے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو تو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور ملک میں اودھم مچاتے نہ پھرو۔ اس کی قوم کے ان بڑوں نے، جنہوں نے گھمنڈ کیا، ان زیر دستوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لائے، کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا فرستادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو اس پیام پر جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں۔ متکبروں نے کہا ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔ تو انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور بولے کہ اے صالح، اگر تم خدا کے فرستادہ ہو تو وہ عذاب ہم پر لاؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو۔ پس ان کو کپکپی نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ تو وہ ان کو چھوڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں نے تمہیں اپنے رب کا پیام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کر دی لیکن تم

خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ ۷۳-۷۹

اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو! تم سے پہلے دنیا کے کسی نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ بڑی ہی اوندھی عقل کے بلکہ حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ اس پر اس کی قوم والوں نے جواب دیا تو یہ دیا کہ ان کو اپنی بستی سے نکالو، یہ بڑے پارسا بنتے ہیں۔ تو ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو، اس کی بیوی کے سوا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی، نجات دی اور ان پر اچھی طرح پتھراؤ کر دیا تو دیکھو، مجرموں کا کیسا انجام ہوا!۔ ۸۰-۸۴

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے دعوت دی، اے میرے ہم قومو، اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی اور تمہارا معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح حجت آچکی ہے تو ناپ تول پوری کرو، لوگوں کی چیزوں میں کوئی کمی نہ کرو اور زمین میں، اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔ اور ہر راہ میں دھمکیاں دیتے، اہل ایمان کو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس راہ کو کج کرتے نہ بیٹھو۔ یاد کرو جب کہ تم تھوڑے تھے تو تم کو خدا نے زیادہ کیا اور دیکھو فساد برپا کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا! اور جب کہ تم میں سے ایک گروہ اس چیز پر ایمان لایا ہے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور اس کی قوم کے بڑوں نے، جنہوں نے تکبر کیا، کہا کہ اے شعیب، ہم تم کو اور جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال کے دم لیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آجاؤ۔ اس نے کہا کیا جب کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہوں تب بھی! ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنے والے ٹھہریں گے اگر ہم تمہاری ملت میں لوٹ آئیں، بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی۔ یہ ہم سے تو ہونے کا نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ ہمارے رب ہی کی مشیت ہو تو اور بات ہے۔ ہمارے رب کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

اور ان بڑوں نے جنہوں نے اس کی قوم میں سے کفر کیا کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو بڑے خسارے میں پڑو گے تو ان کو کپکپی نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ جنہوں نے شعیب کی تکذیب کی گویا کبھی اس بستی میں بسے ہی نہیں، جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی نامراد ہوئے تو وہ ان کو یہ کہہ کر چھوڑ کر چل دیا کہ اے میرے ہم قومو! میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے، تمہاری خیر خواہی کر دی تو اب میں کفر کرنے والوں کا غم کیوں کھاؤں!! ۸۵-۹۳

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

لقد ارسلنا نوحًا الی قومہ الایہ۔ اس سورہ میں چونکہ قریش کو آگاہ کیا جا رہا ہے اس وجہ سے پہلے انہی قوموں کو لیا ہے جو عرب کے شمال یا جنوب یا شمال مغرب میں نامور ہوئیں اور جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں کیفر کردار کو پہنچیں۔ ترتیب بیان بالکل تاریخی ہے اسی وجہ سے قوم نوح کو سب سے پہلے لیا۔ اور ہر قوم کی سرگزشت میں سے صرف اتنا ہی حصہ نمایاں کیا ہے جتنا انذار کے مقصد کے لحاظ سے ضروری تھا۔

فقال یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ تمام فساد فی الارض کی جڑ شرک ہے۔ کسی قوم کے شرک میں مبتلا ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نظریات و عقائد اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اعمال و اخلاق ہر چیز میں فطرت کی صراط مستقیم سے منحرف ہو گئی اور اب زمین میں اسکا بڑھنا کسی خیر و صلاح کا بڑھنا نہیں بلکہ شر و فساد کا بڑھنا ہے اور جب تک یہ قوم باقی رہے گی اس کے ہاتھوں انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں فساد ہی کو فروغ حاصل ہو گا۔ اس وجہ سے اللہ کے رسول اپنی اصلاح کی دعوت اسی اصل نقطہ سے شروع کرتے ہیں اور یہ چیز انبیاء و رسل کی دعوت کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے کسی نبی کی دعوت بغیر اس خصوصیت کے پائی جائے۔

انبیاء کی دعوت کی مشترک حقیقت

انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم۔ یہ وہ اصل انذار ہے جو حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو سنایا کہ اگر تم اپنے اس شرک سے تائب ہو کر خالص اللہ ہی کی عبادت و طاعت کی راہ پر نہ آ گئے، تو بس سمجھ لو کہ تم پر ایک ہولناک دن کا عذاب نازل ہوا ہی چاہتا ہے۔ ہولناک دن سے مراد یہاں دنیوی عذاب کا ہولناک دن ہے۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ اللہ کے رسول اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کے لازمی نتیجہ کے طور پر دنیا میں آتا ہے اور دوسرے اس عذاب سے جس سے جزا و سزا کے فیصلے کے دن آخرت میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔ یہاں قرینہ دلیل

اللہ کے رسول دو عذابوں سے ڈراتے ہیں۔

ہے کہ عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہے۔ اس کو ہولناک دن سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ رسول کی تکذیب کے نتیجے کے طور پر جو عذاب آتا ہے وہ تذکیر و تنبیہ کی نوعیت کا عذاب نہیں ہوتا بلکہ یہ عذاب اس قوم کی جڑ کاٹ دیا کرتا ہے جس کے بعد قومی حیثیت سے اس کا نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جایا کرتا ہے۔ سورۂ شعراء میں حضرت ہودؑ کی زبان سے نقل ہوا ہے: "انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم ۱۳۵۔ شعراء" پھر ان کی قوم کا جواب اور اس جواب کی پاداش میں ان پر دنیا میں عذاب کا آنا یوں بیان ہوا ہے: "وما نحن بمعذبین فکذبوہ فاھلکناھم ان فی ذلک لایۃ ۱۳۸-۱۳۹۔ (اور ہم پر ہرگز عذاب نہیں آئے گا، تو انہوں نے اس کو جھٹلا دیا، پس ہم نے ان کو ہلاک کر چھوڑا اور بے شک اس میں بہت بڑی نشانی ہے)

حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا سوال و جواب

"قال الملأ من قومہ الآیۃ"۔ "ملأ" کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ "انا لنراک فی ضلال مبین" یعنی تمہاری ان باتوں کی بنا پر ہم تم کو کھلی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ اول تو تم نے باپ دادا کے دین کی تحقیر کی کہ جن معبودوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ان کا تم انکار کر رہے ہو، پھر ستم یہ ہے کہ ہمارے اوپر عذاب الٰہی نازل ہونے کی دھمکی بھی سنا رہے ہو درآنحالیکہ ہمارے حالات تم سے اور تمہارے تمام پیرواؤں کے حالات سے ہر اعتبار سے اچھے ہیں۔

"قال یقوم لیس بی ضلالۃ ولکنی الآیۃ"۔ حضرت نوحؑ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے کوئی سرپھرا اور بھٹکا ہوا آدمی نہ سمجھو، میں تمام عالم کے رب کی طرف سے تمہارے پاس پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہوں اور جو کچھ تمہیں سنا رہا ہوں وہ بے کم و کاست خدا ہی کی طرف سے سنا رہا ہوں، کوئی بات اپنی طرف سے نہیں سنا رہا ہوں۔

"ابلغکم رسالات ربی وانصح لکم واعلم من اللہ ما لا تعلمون"۔ یہ خدا کا پیغام بھی ہے اور میری طرف سے تمہارے حق میں انتہائی خیر خواہی بھی کہ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی، ناقدری و دل آزاری، دشمنی اور بیزاری کے باوجود تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہوں اور تمہارے ہاتھوں سب کچھ جھیل رہا ہوں۔ جذبۂ ہمدردی و خیر خواہی کے سوا کسی اور جذبے کا میری اس تمام تگ و دو میں کوئی شائبہ نہیں۔ بس یہ اندیشہ اور یہ غم ہے کہ تم کہیں خدا کی آخری پکڑ میں نہ آ جاؤ۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو اس وجہ سے تمہیں عذاب کا ڈراوا عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن میں خدا کی طرف سے وہ بات بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ تم اپنے ظاہر کی چمک دمک کے ساتھ اگر اپنے اُن روگوں سے بھی باخبر ہوتے جو تم نے اپنے سفید کپڑوں کے نیچے چھپا رکھے ہیں تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ میں کتنی سچی بات کہہ رہا ہوں۔

'اوعجبتم ان جاءکم ذکر من ربکم الاٰیۃ'۔ یعنی کیا میری بات ماننے میں یہ چیز تمہیں مانع ہو رہی ہے کہ اللہ نے تمہی میں سے ایک شخص پر تمہارے لیے یاد دہانی اتاری تاکہ وہ سامنے کے خطرے سے تمہیں آگاہ کر دے، تاکہ تم اللہ سے ڈرو اور اس کی رحمت کے سزاوار بنو! یہاں سوال اٹھا کر بات چھوڑ دی ہے، جواب نہیں دیا ہے، اس لیے کہ اندازِ کلام اظہارِ حسرت و افسوس کا ہے۔ اس اسلوب بیان میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر تم سوچتے، غرور و انانیت کو راہ نہ دیتے، تو یہ چیز تمہارے لیے تعجب اور استکبار کے بجائے ممنونیت اور شکرگزاری کا باعث ہوتی کہ خدا نے تمہارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمہیں نجات کی راہ دکھانے کے لیے اٹھایا۔ میں تمہارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں، میرا ماضی و حاضر اور میرا اخلاق و کردار سب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری زبان تمہاری زبان اور میرا دل تمہاری اپنی فطرت کا ترجمان ہے تو کیا یہ بہتر ہوتا کہ تم پر اتمامِ حجت کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا یا یہ بہتر ہے کہ تمہاری اپنی ہی زبان اور تمہارا اپنا ہی درد آشنا دل تم پر گواہی دے؟ اسلوب کلام میں یہ ساری داستان مضمر ہے۔ اور یہ اضمار ہی اس محل میں تقاضائے بلاغت ہے۔ آخر ان لوگوں کو غم دل سنانے سے کیا حاصل جو سننے سے پہلے ہی اعتراض و نکتہ چینی کے لیے پر تولے ہوئے ہوں۔

'لینذرکم و لتتقوا و لعلکم ترحمون'۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کے انذار کا اصل مقصد لوگوں کے اندر خشیت و تقویٰ پیدا کرنا ہوتا ہے اور یہی خشیت و تقویٰ ہے جو دنیا اور آخرت میں لوگوں کو رحمت الٰہی کا سزاوار بناتی ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ نشانیٔ عذاب اور فرشتوں کے مشاہدے کے منتظر ہوتے ہیں وہ درحقیقت اپنے لیے عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔

'فکذبوہ فانجینٰہ والذین معہ فی الفلک الاٰیۃ'۔ یعنی بالآخر وہ بات ہو کے رہی جس سے حضرت نوحؑ نے ڈرایا تھا۔ جب قوم نے تکذیب کر دی اور حضرت نوحؑ کی طویل جد و جہد کے بعد بھی اپنے رویّے کی اصلاح پر آمادہ نہ ہوئی تو ان لوگوں کے سوا جنہوں نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں پناہ لی سب کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ اس طوفان کی نوعیت پر ہم اس مقام میں بحث کریں گے جہاں قرآن نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ یہاں صرف یہ بات یاد رکھیے کہ غرق صرف وہ لوگ کیے گئے جو پیغمبر اور آیاتِ الٰہی کی تکذیب پر اڑے رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ پیغمبر کی تکذیب کے نتیجے میں جو عذاب آتا ہے وہ انہی لوگوں پر آتا ہے جن پر پیغمبر اپنی حجت پوری کر دیتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم دجلہ و فرات کے دوآبہ میں آباد تھی۔ اس علاقہ کے سوا اس زمانے میں کہیں اور انسانی آبادی تھی یا نہیں؟ یہ سوال تاریخ کے ایک ایسے دور سے متعلق ہے جس کا تعلق حقائق سے زیادہ قیاسات اور تخمینوں سے ہے۔ ہم یہاں

اس سوال پہ کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ یہ بات سنت الٰہی کی اٹل حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ عذاب صرف انہی لوگوں پہ آیا جنہوں نے حضرت نوحؑ کی تکذیب کی۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عذاب اور ابتلا میں فرق ہوتا ہے۔ ایک تو یہ شکل ہوتی ہے کہ کسی قوم پہ کوئی مصیبت، قحط، وبا، زلزلہ، طوفان وغیرہ کے قسم کی اللہ تعالیٰ اس لیے بھیجتا ہے کہ اہل غفلت اپنی غفلت کی نیند سے بیدار ہوں۔ اس قسم کے ابتلائی مصائب جب نازل ہوتے ہیں تو ان میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی آفت صرف مجرموں ہی تک محدود رہے بلکہ اچھے برے سب ان کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم پہ اس کے اعمال کی پاداش میں، اتمام حجت کے بعد، کوئی فیصلہ کن عذاب بھیجتا ہے۔ اس صورت میں عذاب کی زد سے وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو اصلاح کرنے والے یا اصلاح کرنے والوں کے پیرو ہوتے ہیں۔

'انھم کانوا قوما عمین'۔ 'عمون' 'عمی' کی جمع ہے۔ یہ لفظ آنکھ کے اندھوں کے لیے بھی آتا ہے اور عقل و دل کے اندھوں کے لیے بھی۔ یہاں یہ عقل و دل کے اندھوں کے لیے آیا ہے۔ یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا بیڑا غرق کر دیا؟ فرمایا کہ یہ اس وجہ سے کہ یہ عقل و دل کے اندھے تھے۔ اللہ کا رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اس ذریعہ کے بروئے کار آ جانے کے بعد قانون الٰہی میں کوئی اور چیز ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کا اتمام حجت کے لیے بروئے کار آنا ضروری ہو۔ اس وجہ سے رسول کے انذار کے بعد بھی جو لوگ آنکھیں نہیں کھولتے وہ دنیا میں اپنے وجود کی خود نفی کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قدرت کیوں باقی رکھے جن کے دل کی آنکھیں چپاٹ ہو چکی ہیں۔

'و الی عاد اخاھم ھودا ..... افلا تتقون'۔ 'عاد' عرب کی قدیم اقوام میں سے ہیں۔ ان کا تعلق سامی نسل سے ہے۔ ان کا مسکن جنوبی عرب میں احقاف کا علاقہ تھا۔ قرآن کے الفاظ 'وجعلکم خلفاء من بعد قوم' سے مترشح ہوتا ہے کہ طوفان نوحؑ کے بعد اس قوم کے پیشروؤں میں سے کچھ لوگوں نے جنوبی عرب کی طرف ہجرت کی اور وہاں رفتہ رفتہ بڑی قوت و شوکت حاصل کر لی۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنے دبدبہ اور صولت کے لیے بھی۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرت ہودؑ کو مبعوث فرمایا۔ 'اخاھم' کے لفظ سے اللہ تعالیٰ نے اس احسان کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی طرف دوسرے مقامات میں 'رسولا منھم' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ 'رسول' کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے۔ اس کی طرف ہم نے اوپر بھی اشارہ کیا ہے اور سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بھی اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اگرچہ ہر احسان کی طرح

قوموں نے اس احسان کی بھی ہمیشہ ناقدری ہی کی ہے۔

'افلا تتقون'۔ یعنی کیا تم خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ بالکل اسی محل میں حضرت نوحؑ نے 'انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم' فرمایا ہے۔

'قال الملاء ..... انا لنراک فی سفاھۃ وانا لنظنک من الکاذبین'۔ یعنی یہ جو تم ہم کو قہر و عذاب سے ڈراتے ہو یہ محض تمہاری خود باختگی ہے۔ ہماری یہ ترقیاں ہمارے مستحق عذاب ہونے کی علامت ہیں یا منظور نظر اور صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی: 'وانا لنظنک من الکاذبین'، یعنی یہ جو تم دعوے کر رہے ہو کہ تم خدا کے فرستادہ ہو اور ہمارے پاس خدا نے تمہیں پیغامبر بنا کر بھیجا ہے، یہ محض تمہاری دھونس ہے اور ہم تم کو بالکل جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں۔

'ابلغکم رسالات ربی وانا لکم ناصح امین'۔ 'ناصح' کے ساتھ 'امین' کی صفت یہاں اسی طرح آئی ہے جس طرح سورہ شعراء میں ہے۔ انی لکم رسول امین ۱۴۳۔ شعراء۔ امانت خیانت کا ضد ہے۔ رسول کی ایک بڑی نمایاں صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ امین ہوتا ہے۔ یعنی جو پیغام اس کے حوالہ کیا جاتا ہے وہ پوری امانت داری کے ساتھ اس کو پہنچاتا ہے؛ اس میں سرمو کمی بیشی نہیں کرتا۔

'واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح'۔ قوم نوحؑ کے بعد عاد کو خلافت دیئے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو بعینہ اسی علاقے میں اقتدار حاصل ہوا جس میں قوم نوحؑ کو حاصل ہوا۔ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ قوم نوحؑ بالکل شمال میں تھی اور عاد کا علاقہ عرب کا جنوبی علاقہ تھا۔ اس خلافت کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح قوم نوحؑ کو اقتدار و تمکن حاصل ہوا، اسی طرح ان کے بعد تم کو حاصل ہوا۔ اس یاد دہانی میں حضرت ہودؑ نے قوم کو اللہ تعالیٰ کا احسان بھی یاد دلایا ہے اور ان کو تنبیہ بھی فرمائی ہے۔ احسان تو واضح ہے کہ جو تمکن و اقتدار قوم نوحؑ کو حاصل تھا وہ ان کو حاصل ہوا اور تنبیہ یہ ہے کہ جب تم قوم نوحؑ کے اقتدار کے وارث ٹھہرائے گئے ہو تو ان کی سرگزشت اور ان کے انجام کو بھی یاد رکھو۔ اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس انجام سے وہ دوچار ہوئے تم اس انجام سے بچ جاؤ۔ خدا کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

'وزادکم فی الخلق بصطۃ'۔ 'خلق' کے معنی یہاں ساخت کے ہیں۔ مثلاً ولامرنھم فلیغیرن خلق اللہ ۱۱۹۔ نساء (اور میں ان کو بہکاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کو مسخ کریں گے)۔ 'ساخت' سے مراد ظاہر ہے کہ باطنی اور ظاہری دونوں ہی ساخت ہے۔ اس لئے کہ شیطان کے ایما سے مشرکوں نے اپنی فطرت کو بھی مسخ کیا اور اپنے بتوں کی خوشنودی کے لیے، جیسا کہ قرآن میں اشارہ ہے، چوپایوں کے کان بھی کاٹے۔ 'بسطۃ' اور 'بصطۃ' دونوں ایک ہی لفظ ہے۔ اس کے معنی کشادگی، وسعت

اور پھیلاؤ کے ہیں۔ ظاہری اور باطنی دونوں ساختوں میں پھیلاؤ اور کشادگی زیادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو خدا نے جسمانی اور عقلی دونوں اعتبار سے تفوق و برتری عطا فرمائی۔ عرب کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد صحت جسمانی کے اعتبار سے بھی نمایاں تھی اور اپنے عقلی کارناموں کے اعتبار سے بھی اس کی بڑی دھاک تھی۔ بقرہ میں طالوت کے متعلق فرمایا ہے 'وزادہ بسطۃ فی العلم والجسم' وہی بات یہاں زادکم فی الخلق بصطۃ سے تعبیر ہوئی۔

'فاذکروا آلاء اللہ لعلکم تفلحون'۔ آلاء جمع ہے اِلیٰ، اِلیٰ، اَلیٰ کی۔ اس کے معنی عام طور پر اہل لغت نے نعمت کے لئے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنی کرشمہ، شان، کارنامہ اور عجوبہ کے ہیں۔ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب - مفردات القرآن — میں اس لفظ کی تحقیق بیان کی ہے۔ انہوں نے مشہور شعرائے جاہلیت کے دس شعر نقل کئے ہیں جن سے وہی معانی نکلتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔

حضرت ہودؑ کی یہ بات بھی اپنے اندر امتنان اور تنبیہ دونوں ہی کے پہلو رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے تمہیں جن جسمانی و عقلی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے ان کی قدر کرو، ان کا شکر ادا کرو، ان کے سبب سے فتنے میں نہ پڑو۔ خدا کی شانوں، عظمتوں اور قدرتوں کو یاد رکھو۔ یہی راستہ فلاح کا راستہ ہے۔ اگر تم نے اکڑ دکھائی تو یاد رکھو، خدا کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہے۔

'قالوا اجئتنا لنعبد اللہ وحدہ ونذر ما کان یعبد اٰباؤنا'۔ اس فقرے میں قوم کا غصہ اور طنز دونوں مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم رسالت کے مدعی ہو کر اس لیے تشریف لائے ہو کہ ہم تمہاری دھونس میں آکر ان معبودوں کو چھوڑ بیٹھیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے؟ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ تم سے توقع تو اس بات کی تھی کہ دین آبائی اور قوم کی عزت بڑھاؤ گے لیکن تم سب کے دشمن بن کر اٹھے۔

'فاتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین'۔ تو سن رکھو کہ تمہاری عذاب کی ان دھمکیوں سے ڈر کر ہم اپنے بزرگوں کے دین سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں۔ اگر اس جرم میں ہم پہ عذاب آنے والا ہے تو وہ عذاب لاؤ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

'قال قد وقع علیکم رجس و غضب'۔ 'قد وقع' اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جیسے 'اتیٰ امر اللہ' ہے۔ یعنی اب یہ چیز لازم ہو گئی، واجب ہو گئی، تم اس کے مستحق ہو گئے۔ بس صرف انتظار باقی رہ گیا ہے۔ 'رجس' کے معنی گندگی اور ناپاکی کے ہیں اور اس سے مراد یہاں کفر و شرک اور اعمال و عقائد کی گندگی و ناپاکی ہے۔ 'رجس' اور 'غضب' میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ

کر رہے ہو تو اب اس میں دیر نہیں ہے، اس کو آیا ہی سمجھو، اس لیے کہ جس ناپاکی و گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ 'رجس' کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقۂ عذاب کو دور نہ سمجھو۔

'اتجادلونني في اسماء سميتموها انتم وابآؤكم ما نزل الله بها من سلطان'۔ یہ قوم کی اس بات کا جواب ہے کہ بھلا ہم اپنے ان معبودوں کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جن کو ہم باپ دادا کے زمانے سے پوجتے آئے ہیں؟ فرمایا کہ تمہاری یہ حجت بالکل بے بنیاد ہے۔ تم جن چیزوں کو پوجتے ہو ان کے نام تو بے شک تم نے کچھ رکھ چھوڑے ہیں لیکن ان ناموں کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی دلیل نہ عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کہیں یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر تم ان کو معبود بنائے بیٹھے ہو اور ان کی حمایت میں مجھ سے لڑ رہے ہو؟ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم مانتے ہی ہو، وہ نزاعی چیز نہیں ہے، اس کی دلیل تمہارے پاس بھی موجود ہے، میرے پاس بھی موجود ہے، رہے تمہارے یہ اصنام خیالی تو ان کے حق میں کیا دلیل ہے جو تم پیش کر سکتے ہو؟

'فانتظروا اني معكم من المنتظرين'۔ مطلب یہ ہے کہ اب اگر عذاب دیکھ کر ہی ماننا ہے تو عذاب کا انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ جہاں تک اس کے اسباب کا تعلق ہے وہ تو تم نے سب فراہم کر چھوڑے ہیں اس وجہ سے اس کا آنا تو امر قطعی ہے۔ لیکن عذاب لانا میرا کام نہیں ہے، خدا کا کام ہے، تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔

'فانجيناه والذين معه برحمة منا وقطعنا دابر الذين كذبوا بآياتنا وما كانوا مؤمنين'۔ یہ اس سنت الٰہی کا بیان ہے جو رسول کے ذریعے سے قوم پر حجت تمام کر دینے کے بعد لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول اور اس کے ساتھیوں کو اپنے فضل خاص سے، اپنی حفاظت میں لے کر علاقہ عذاب سے نکال دیتا ہے اور رسول کے تمام جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو اس وقت نازل ہوتا ہے جب مخاطب قوم اپنی ہٹ اور ضد سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر صلاحیت ایمان کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے۔ 'وما كانوا مؤمنين' سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

'والى ثمود اخاهم صالحا'۔ ثمود، عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ ان کو عاد ثانی بھی کہتے ہیں۔ ان کا مسکن عرب کے شمال مغرب میں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قوم عاد کی تباہی کے وقت جو لوگ عذاب سے محفوظ

قوم ثمود اور حضرت صالح علیہ السلام

رہے انہوں نے جنوب سے شمال مغرب کی طرف ہجرت کی ہو اور پھر حجر میں سکونت اختیار کر لی ہو۔ عاد و ثمود کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی سے بیان ہوئے ہیں۔ بعض شاعر تو ان دونوں قوموں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، گویا ان کے درمیان کوئی فرق سرے سے ہے ہی نہیں۔ دونوں کے لیڈر۔ قیل اور قدار۔ جن کے ہاتھوں ان قوموں پر تباہی آئی، عربی ادب میں ضرب المثل ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے تھے۔

"قد جاءتکم بینۃ من ربکم ۖ ھذہ ناقۃ اللہ لکم ایۃ فذروھا تاکل فی ارض اللہ ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم"۔ یہ حضرت صالح کی طرف سے قوم کے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے۔ حضرت صالحؑ نے قوم کو بار بار خدا کے عذاب سے ڈرایا کہ یہ نہ سمجھو کہ آج جس عیش و آرام میں مگن ہو، جن باغوں اور چشموں میں عیش کر رہے ہو، جن کھیتوں اور فصلوں کی بہاریں لوٹ رہے ہو، جن تعمیرات اور ترقیوں میں گم ہو، یہی لیل و نہار ہمیشہ رہیں گے۔ خدا کی پکڑ سے بچو، میری بات مانو اور اپنے ان حکام اور بگٹٹ لیڈروں کی پیروی نہ کرو جو خدا کی زمین میں فساد برپا کر رہے ہیں، اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں نہ جھونکو۔ قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ تم تو ہمیں ایک سحر زدہ اور خبطی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہم تمہاری یہ تمام لن ترانیاں کس طرح مان لیں جبکہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو۔ ہم تو تمہاری بات اس وقت باور کریں گے جب تم اس عذاب کی کوئی نشانی لاؤ جس کے تم ہمیں ڈراوے سنا رہے ہو۔ ان کے اس مطالبہ کے جواب میں حضرت صالحؑ نے ایک اونٹنی نامزد کر دی کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ یہ تمہارے لیے عذاب الٰہی کی نشانی ہے، اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو بس سمجھ لو کہ تم پر عذاب آ دھمکے گا۔ اس کو عذاب کے بند کی دیوار سمجھو، اگر تم نے اس دیوار کو توڑا تو تم کو قہر الٰہی کے سیلاب سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی۔

اس اونٹنی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے مقصود اللہ کے لیے اس کی تخصیص کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ یہ خدا کی نذر اور اس کے لیے نامزد ہے۔ یہ تخصیص اور نامزدگی اسی نوعیت کی تھی جس طرح کی تخصیص اور نامزدگی ہمارے ہاں ہدی اور قلائد کے جانوروں کی ہوتی ہے۔ جس طرح اسلام میں ہدی و قلائد پر حملہ کرنا ایک عظیم جرم ہے اسی طرح حضرت صالحؑ نے اس اونٹنی کی بابت فرمایا کہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے، یہ امان کی دیوار ہے، اگر تم نے اس کو کوئی گزند پہنچایا تو میں جس عذاب سے تم کو آگاہ کر رہا ہوں وہ تم پر ٹوٹ پڑے گا۔

اونٹنی کی نامزدگی کی مصلحت

اس اونٹنی کو حضرت صالحؑ نے ایک احساس پیما آلہ (FEELER) کی حیثیت سے نامزد کیا تھا کہ اس تاکید و تنبیہ کے باوجود اگر قوم نے اس کو ہلاک کر دیا تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہو گا کہ اب یہ ظالم لوگ ان کو بھی نعوذ باللہ جھوٹا سمجھ کر قتل کرنے کی جسارت کر گزریں گے۔ سنت الٰہی کے تحت کسی قوم کی جرأت و جسارت

کا یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں رسول کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور قوم پہ عذاب آتا ہے۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات کہیں نہیں نکلتی کہ یہ اونٹنی اپنی خلقت کی اعجوبگی کے پہلو سے کوئی نشانی تھی بلکہ "ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم" سے صاف واضح ہے کہ وہ گزند پہنچائے جانے کے انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے نشانی تھی۔ جہاں تک علم ہے اس اونٹنی کا کسی پہاڑ یا پہاڑی سے پیدا ہونا کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان تفسیری روایات کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ یہ اونٹنی ایک پہاڑ سے پیدا ہوئی تھی۔ آیت کے معنی نشانی اور علامت کے ہیں۔ یہ اونٹنی قوم کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ایک نشانیٔ عذاب کی حیثیت سے نامزد کی گئی تھی چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ جب ثمود کے لیڈر نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس کے تیسرے دن عذاب الٰہی آدھمکا۔ یہ واقعہ قرآن میں جستہ جستہ مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ ہم یہاں تقریب فہم کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ ۝ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۝ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝

ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی، جبکہ ان کے بھائی صالح نے کہا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ میں تمہاری طرف خدا کا ایک رسول ہوں امانت دار۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب نہیں ہوں، میرا صلہ تو بس عالم کے رب ہی کے ذمہ ہے۔ کیا تم جس عیش و نعم میں یہاں ہو اسی میں چھوڑے رکھے جاؤ گے؟ باغوں اور چشموں میں، کھیتیوں اور نخلستانوں میں جن کے گچھے بوجھ سے ٹوٹے پڑتے ہیں؟ اور تم پہاڑوں میں خوش خوش گھر تراشتے رہو گے؟ تو اللہ سے ڈرو، اور میری بات مانو، اور ان بے قیدوں اور مطلق العنانوں کے کہے میں نہ آؤ جو ملک میں فساد مچاتے ہیں اور کوئی اصلاح کرنے پہ آمادہ نہیں۔ انہوں نے جواب دیا تم

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

۱۴۱-۱۵۸ - شعراء

پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے، تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو تو اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی دکھاؤ۔ اس نے کہا یہ اونٹنی ہے۔ ایک دن پانی کی باری اس کی اور ایک روز مقررہ کی باری تمہاری اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچاؤ ورنہ ایک ہولناک دن کا عذاب تم کو آ پکڑے گا۔ تو انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں، پھر انہیں پچھتانا پڑا۔ ان کو عذاب نے آ پکڑا۔ بے شک اس کے اندر نشانی ہے اور ان کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں تھی۔

مطالبۂ عذاب کے جواب میں عذاب کے بجائے ایک نشانیٔ عذاب کی نامزدگی اللہ تعالیٰ کی رحمت و رافت کی دلیل تھی۔ وہ قہر میں دھیما اور رحمت میں جلدی کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے یہ پسند فرمایا کہ لوگوں کو مزید مہلت دے کہ اب بھی وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں لیکن انہوں نے متنبہ ہونے کے بجائے جسارت کا آخری قدم اٹھا دیا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ اس کے بعد اگرچہ کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی تاہم قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے کہ خطرے کے حدود لانگ جانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو تین دن کی مہلت دی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرنا چاہیں تو کر لیں۔

اونٹنی سے متعلق حضرت صالحؑ نے یہ ہدایت جو فرمائی کہ یہ پورے علاقے میں چھوٹی پھرے، کوئی اس سے تعرض نہ کرے اور چشمے پر اس کے پانی پینے کا دن بالکل الگ ہو، اس دن دوسرے اپنے جانوروں کو گھاٹ پر نہ لے جائیں، یہ ہدایت قوم کی آزمائش کے لیے تھی کہ ان کے اندر جو کھوٹ اور عناد ہے، ابھر کر سامنے آ جائے کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ ۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہ لوگ عاد کے بقایا میں سے تھے اور ان کا علاقہ عرب کے شمال مغرب میں حجر کا علاقہ تھا۔ ان لوگوں کو وہاں بڑا عروج و اقتدار حاصل ہوا۔ ان کی بہت سی تعمیری یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ قریش کے قافلے اپنے شام کے سفر میں ان کی بستیوں پر سے گزرتے تھے اس وجہ سے ان کی سرگزشت ان کے لیے شنیدہ بھی تھی اور دیدہ بھی۔ حضرت صالحؑ نے ان کو جو عاد کی خلافت یاد دلائی اس کا مقصد، جیسا کہ ہم نے

اوپر اشارہ کیا، ان کو متنبہ کرنا تھا کہ اپنے اقتدار کے نشہ میں خدا کے اقتدار کو نہ بھولو، اس نے جو معاملہ عاد کے ساتھ کیا، وہی تمہارے ساتھ کرے گا۔ وہ ایک ہی ترازو سے سب کے لیے تولتا ہے۔

'تتخذون من سهولها قصورا وتنحتون الجبال بيوتا' 'سہل' اور 'جبل' دونوں مقابل الفاظ ہیں 'سہل' پہاڑی علاقہ کے مقابل میں میدانی علاقہ کو کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے تمدنی اور تعمیری اعتبار سے، اپنے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ میدانی علاقوں میں بھی انہوں نے عالی شان محل تعمیر کیے اور پہاڑی علاقوں میں بھی پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بنائے۔ ان کے دور کے بعض تعمیری آثار آج بھی موجود ہیں جو فن تعمیر میں ان کے کمال کی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے ان کے ان تمام تعمیری ولولوں پر عین ان کے دور عروج میں ماتم کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عالیشان اور لق و دق عمارتیں بنانا قوم کے عروج کی نہیں بلکہ تمدن کے فساد اور قوم کے زوال کی نشانی ہے۔ یہی فلک بوس عمارتیں بالآخر اس کے عروج و کمال کے مقبرے اور مدفن بنتی ہیں اور ایک دن زاغ و زغن ان میں اپنے آشیانے بناتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے ان کو یاد دلایا کہ لوگو، خدا کی نشانوں اور اس کی عظیم قدرتوں کو یاد کرو اور خدا کی زمین میں مفسد بن کر سر نہ اٹھاؤ۔ فاذكروا آلاء الله ولا تعثوا في الارض مفسدين۔

'قال الملاء الذين استكبروا من قومه للذين استضعفوا لمن آمن' 'مستضعف' کے معنی ہیں زیر دست، دبائے ہوئے، بے زر، مظلوم۔ انبیاء کی دعوت قبول کرنے میں ہمیشہ غریبوں اور کمزوروں ہی نے سبقت کی ہے، اس لیے کہ وہ استکبار کے حجاب سے پاک ہوتے ہیں اور استکبار ہی وہ چیز ہے جو قبول حق میں سب سے بڑا مانع ہے۔ ابلیس کی سرگزشت میں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

'اتعلمون ان صالحا مرسل من ربه قالوا انا بما ارسل به مومنون' اہل ایمان سے مستکبرین کا یہ سوال استہزاء کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ اس شخص کو خدا کا رسول سمجھ بیٹھے ہو تو بڑے ہی کم عقل اور بدھو ہو۔ اہل ایمان کا جواب کہ "ہم تو اس پیغام پر ایمان رکھتے ہیں جو وہ دے کر بھیجے گئے ہیں" سوال کے اصل جواب سے ایک قدم آگے ہے۔ انہوں نے حضرت صالحؑ کی صرف رسالت کے اقرار ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی اصل دعوت کی صحت و صداقت پر اپنے کامل ایمان اور اس ایمان پر اپنے پختہ عزم و جزم کا اظہار بھی کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مستکبرین کو اصل چڑ حضرت صالحؑ سے نہیں بلکہ ان کی دعوت اور ان کے پیغام ہی سے تھی۔ چنانچہ اہل ایمان نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر ان کے اندر کے چھپے ہوئے اس خناس ہی پر ضرب لگائی اور یہ گویا اینٹ کے جواب میں پتھر تھا جس نے

جس نے ثابت کر دیا کہ اب تک جو لوگ دبے ہوئے یا دبائے ہوئے تھے اب وہ اس حق کے معاملے میں کسی سے دبنے والے نہیں۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ رسولوں پر ایمان لانے والے اگرچہ ابتداءً غریب اور کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں لیکن جو چیز ان کو اپیل کرتی ہے وہ نبی کی دعوت کی قوت و حجت ہوتی ہے نہ کہ معجزے اور کرشمے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنی بڑائی اور ذہانت و فطانت کے مدعی ہوتے ہیں وہ آخر تک نشانیوں اور معجزوں ہی کے چکر میں پھنسے رہ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب اللہ کا عذاب ان کی کمر توڑ دیتا ہے۔

'قال الذین استکبروا الایہ'۔ یہ مستکبرین کی طرف سے آخری جھلاہٹ کا اظہار ہے کہ تم نے صالحؑ کو مان لیا ہے تو مانو ہم تو اس شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں، ہم اس کا صاف انکار کرتے ہیں۔

'فعقروا الناقۃ وعتوا عن امر ربھم وقالوا یٰصٰلح ائتنا بما تعدنا ان کنت من المرسلین'۔ 'عقر' کے معنی اونٹ یا اونٹنی کی کونچیں کاٹ دینے کے ہیں۔ 'عتو' کا صلہ جب 'عن' کے ساتھ آئے تو یہ سرکشی اور نافرمانی دونوں کے مفہوم پر متضمن ہوتا ہے۔ یہ قوم کے متمردین کی طرف سے تمرد کا آخری قدم تھا۔ انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالحؑ کو چیلنج کیا کہ لو ہم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، تم نے دھمکی دی تھی کہ ہم نے اس کو گزند پہنچایا تو ہم پر عذاب آ جائے گا تو اگر تم خدا کے فرستادہ ہو تو عذاب لاؤ۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ یہ قوم کی طرف سے حضرت صالحؑ کی تکذیب کا گویا آخری اور حتمی عملی اعلان تھا۔ اس کے بعد اگر ان کو مزید مہلت ملتی تو اب ان کا حملہ حضرت صالحؑ ہی پر ہوتا اس وجہ سے تیسرے دن ان پر عذاب آ گیا۔ اونٹنی کو ہلاک کرنے کا جرم اگرچہ، جیسا کہ سورہ شمس میں تصریح ہے، ثمود کے سرکش لیڈر نے کیا تھا لیکن تمام متمردین اس کے اس فعل پر راضی تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوب سب ہی کی طرف کیا۔

'فاخذتھم الرجفۃ فاصبحوا فی دارھم جاثمین'۔ 'رجفۃ' کے معنی شدت کی حرکت، کپکپی اور تھرتھراہٹ کے ہیں۔ یہ اس عذاب کی تعبیر ہے جو قوم ثمود پر آیا۔ قرآن نے اس عذاب کو دوسری جگہ 'صیحہ' سے بھی تعبیر کیا ہے جس کے معنی ڈانٹ کے ہیں، بعض جگہ 'صاعقہ' سے تعبیر کیا ہے (مثل صاعقۃ عاد و ثمود) جس کے معنی کڑکے کے ہیں، سورہ حاقہ میں 'طاغیۃ' سے تعبیر کیا ہے (فاما ثمود فاھلکوا بالطاغیۃ) جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی کے ہیں۔

مولانا فراہیؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں عاد وثمود دونوں قوموں کے عذاب کی نوعیت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ آخر میں خلاصۂ بحث ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

"اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے سرمائی بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب بھیجا۔ چونکہ اصل تباہی زیادہ تر ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی اس وجہ سے اگر اثر سے مؤثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ثمود پر اللہ تعالیٰ نے سرما کے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہری کر دینے والی چیخ بھی چھپی ہوئی تھی جس طرح کہ قوم عاد پر رعد و برق والے بادل بھیجے۔"

بہرحال 'رجفہ' کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ زلزلہ کا عذاب تھا۔ 'رجفہ' مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے، شمال سے باد تند، جس کو صرصر کہتے ہیں، چلی اور وہ اتنی سخت و شدید ہو گئی کہ اس نے ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیا۔ کڑکے کی شدت ایسی بے پناہ ہوئی کہ لوگ اوندھے منہ زمین پر پڑے رہے اور اسی حال میں ہلاک ہو گئے۔

'دار' کا لفظ یہاں 'دیار' کے معنی میں ہے۔ چنانچہ سورہ ہود آیت ۶۵ میں لفظ 'دار' استعمال ہوا، پھر اسی ثمود کے ذکر میں آیت ۶۷ میں 'دیار' استعمال ہوا۔ یہ قرآن نے گویا خود لفظ کی تفسیر کر دی۔

"فتولی عنھم وقال یا قوم لقد ابلغتکم رسالۃ ربی ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین ۶" یہ قوم سے حضرت صالحؑ کا آخری خطاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انہوں نے عذاب آنے سے پہلے اس وقت فرمایا ہے جب قوم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر عذاب کے بند کو گویا توڑ دیا ہے۔ یہی وداعی فقرہ کہہ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہجرت فرمائی ہوگی۔ اس لیے کہ رسولوں کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے، اللہ کے حکم سے، وہ علاقۂ عذاب سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ اونٹنی کے قتل کے بعد حضرت تین دن کی قوم کو مہلت ملی۔ اس تین دن کی مہلت میں جہاں بعض دوسری مصلحتیں مخفی وہاں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ اس اثنا میں حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھی علاقہ سے اتنے دور نکل جائیں کہ عذاب کا کوئی جھونکا ان کو نہ چھو سکے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب بیان میں اس بات کو عذاب کے ذکر کے بعد کیوں کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اس کے نتیجہ کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں عذاب کو قتل ناقہ کے ساتھ متصل کر دیا اور حضرت صالحؑ کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کر دیا۔ گویا جونہی انہوں نے ناقہ کو گزند پہنچا کر خدا کو چیلنج کیا عذاب آ دھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی

طرح ظاہر نہ ہو سکتی اگر اس بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آجاتی۔ قرآن میں اس اسلوب مباورت کی مثالیں بہت ہیں۔ آگے قوم شعیبؑ کی سرگزشت میں بھی اس کی مثال ہے۔ سورہ ہود میں، حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیات ۴۳، ۵۱ ملاحظہ ہوں، نہایت واضح اور بلیغ مثال اس اسلوب کی موجود ہے۔

'یا قوم لقد ابلغتکم الایہ' سے ایک حقیقت یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ان انبیاءؑ کے خطاب میں 'یا قوم' 'یا قوم' کا لفظ جو بار بار آتا ہے یہ محض دلداری اور استمالت کی نوع کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ جس طرح ہر شخص پر اس کے اپنے وجود، اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان کا ایک حق ہوتا ہے اسی طرح اپنی قوم اور اپنے وطن کا بھی اس پر ایک حق ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پورے اخلاص، پوری دلسوزی اور پوری جاں بازی کے ساتھ اس کی خیر خواہی کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اپنی قوم کے حق سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ جو شخص یہ حق ادا کر چکتا ہے وہ اللہ کے نزدیک سرخ رو ہے، اس سے اس باب میں کوئی پرسش نہیں ہو گی کہ قوم تباہی کی راہ پر کیوں گئی، ہدایت کی راہ پر کیوں نہ چلی؟ لیکن جنھوں نے یہ حق ادا نہیں کیا ہے وہ اس حق کے باب میں عند اللہ لازماً مسئول ہوں گے۔

'و لکن لا تحبون الناصحین' محض اظہار حسرت کا کلمہ نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ قوم کے قومی مزاج کے بگاڑ کا ایک درجہ و مرحلہ وہ بھی ہوتا ہے جب تمام پیمانے اس طرح پلٹ اور تمام اقدار اس درجہ متغیر ہو جاتے ہیں کہ خیر خواہی کا کلمہ کہنا جان جوکھوں کا کام بن جاتا ہے۔ جو لوگ عذاب الٰہی کے بند کو توڑتے ہیں وہ قوم کے لیڈر اور ہیرو بن جاتے ہیں اور جو اس عذاب سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بد خواہ، غدار اور قوم کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ قومی فساد مزاج کی یہی وہ حد ہے جہاں پہنچ کر لازماً قوم تباہی سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ جب کسی مریض کا یہ حال ہو جائے کہ اسے معالجوں اور طبیبوں سے دشمنی ہو جائے اور صرف انہی کے مشورے اسے پسند آئیں جو اس کے مرض میں اضافہ کے خواہش مند ہوں تو موت کے سوا اس کے لیے اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے۔

براہ کرم مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھیے:

(۱) ادارتی اور انتظامی امور کو ایک ہی خط میں گڈمڈ نہ کیجیے۔

(۲) انتظامی امور سے متعلق خطوط میں اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے: شکریہ

(منیجر، 'میثاق' لاہور)

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبر قرآن

جلد اوّل ——— مشتمل بر

مقدمہ و تفسیر آیت بسم اللہ، سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران

سائز ۲۲×۲۹ : صفحات ۸۸۰

عمدہ دبیز سفید کاغذ ——— آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ہدیہ تیس روپے ——— محصول ڈاک : ڈھائی روپے

(بتیس روپے پچاس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی طلب کریں :)

نمونہ کے صفحات مفت طلب فرمائیں

اس کے علاوہ

تفسیر آیت بسم اللہ۔ وسورۂ فاتحہ

علیحدہ مطبوعہ بھی موجود ہے

بڑا سائز، کاغذ سفید، صفحات ۳۶ ہدیہ ۷۵ پیسے

(بذریعہ ڈاک طلب فرمانے کے لیے پچاسی پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں)

شائع کردہ: دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

——— فون: ۶۹۵۲۲ ———

ہم سے طلب فرمائیں

(۱)

مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تصنیف

دعوتِ دین اور اس کا طریق کار

سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۲۳۲، طباعت آفسٹ، مجلد مع خوشنما ڈسٹ کور

قیمت -/۵ روپے (محصول ڈاک علاوہ)

(۲)

مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک بصیرت افروز مقالہ

اقامتِ دین کیلئے انبیاء کرام کا طریقِ کار

سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۳۲، قیمت: پچاس پیسے

(تقسیم عام کے لیے دعائیہ قیمت -/۲۰ روپے سینکڑہ)

دارالاشاعت اسلامیہ: کوثر روڈ، اسلام پورہ: لاہور

ہم سے طلب فرمائیں

سلسلہ اشاعت قرآن اکیڈمی

نمبر ۴

قرآن اور امن عالم

تالیف: ڈاکٹر اسرار احمد

سائز کتابی، عمدہ سفید کاغذ پر ٹائپ کی طباعت

صفحات ۲۶ - قیمت پچاس پیسے

نمبر ۵

قرآن اور پردہ

تالیف: مولانا امین احسن اصلاحی

سائز کتابی، عمدہ سفید کاغذ پر ٹائپ کی طباعت

صفحات ۳۲: قیمت ساڑھے پیسے

(محصول ڈاک علاوہ)

دارالاشاعت الاسلامیہ: کوثر روڈ۔ اسلام پورہ۔ لاہور

تقریظ و تنقید

ادارہ

"صحابہ کرامؓ اور اُن پر تنقید"

اِس کتاب کے مصنف مولانا محمد عبداللہ صاحب ہیں۔ مکتبہ رشیدیہ غلہ منڈی ساہیوال سے شائع ہوئی ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۶۸ ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

یہ تصنیف مودودی صاحب کی تصنیف "خلافت و ملوکیت" پر کتاب و سنت اور اجماع امت کی روشنی میں اصولی تبصرہ ہے۔ مصنفِ کتاب مولانا محمد عبداللہ صاحب مودودی صاحب کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اور جس ادب سے انہوں نے مودودی صاحب کو بار بار اس کتاب میں یاد کیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ "حق صحبت اہلِ گذشت" کو نہیں بھولے ——— مگر ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ کتاب "خلافت و ملوکیت" کا مطالعہ کرنے کے بعد خاموش بھی نہ رہ سکتے تھے مودودی صاحب، بخیال خویش کچھ بھی ہوں انہیں اصحابؓ رسولؐ کے منہ آنے کی جسارت نہ کرنی چاہیئے تھی۔ اور پھر جسارت بھی حضرت ذی النورین عثمانؓ بن عفانؓ کی شان میں ——— وہ حضرت عثمانؓ جو واقعہ بیعتِ رضوان کا "عنوان" تھے اور یہ وہ مرحلہ و مقامِ خلوص تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا "کوئی شخص بھی جو حدیبیہ میں موجود تھا دوزخ میں نہ جائے گا" (لن یلج النار اَحَدٌ شھد الحدیبیہ)

مولانا عبداللہ صاحب نے اس مختصر سی تصنیف میں بڑی محنت اور خوبی سے قدمائے محدثین کے اقوال کا حوالہ دے کر واضح کیا ہے کہ اصحابؓ الرسولؐ کے اختلافات کا مسئلہ ایسا ہے کہ ہمیں اس ضمن میں قاضی اور جج نہیں بننا چاہیئے ——— ان کے اختلافات میں بہرحال ذاتی خواہش نہ تھی۔ انہوں نے جو کچھ کیا اور کہا لوجہ اللہ کیا اور کہا۔ حد یہ ہے کہ خود مودودی صاحب کا عقیدہ بھی یہی رہا ہے۔ مثلاً مولانا عبداللہ صاحب ترجمان القرآن شمارہ ۲ تا ۵ ج ۴۴ کے حوالے سے مودودی صاحب کی اپنی رائے نقل

کرتے ہیں " سنیت کا انکار کرکے تم جس وادی میں چاہو بھٹکو ——— اہل سنت و الجماعت کو تم سے بحث نہیں ہوگی۔ لیکن سنی کہلا کے تمہیں اُن کی توہین کرنے کا کیا حق ہے جن کی پیروی امت کے لئے خود ایمان اور ذریعہ نجات قرار دی گئی ہے" ——— یہ کوہ ہمالیہ جتنا عظیم الشان تضاد مودودی صاحب کی اپنی نگاہوں سے کیونکر پوشیدہ ہے۔ وہ بفضل خدا تا حال سنی ہیں اور اگر روش بدل لی ہے تو اعلان فرمائیں۔ ازاں بعد مسلمانوں کا سوادِ اعظم اُن سے کوئی تعرض نہ کرے گا۔ آخر انہوں نے خود ہی تو لکھا ہے " خلافت راشدہ محض ایک سیاسی حکومت نہ تھی بلکہ نبوت کی مکمل نیابت تھی ..... یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ صرف خلافت راشدہ ہی نہ تھی بلکہ خلافت مرشدہ بھی تھی ! (خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۰۵)

اور پھر خود ہی خلافت "راشدہ" اور مرشدہ" کے دو ستونوں عثمانؓ اور علیؓ کو مورد الزام بھی ٹھہراتے ہیں ——— خاص طور پر حضرت عثمانؓ کی تو خوب خبر لیتے ہیں اور یاد نہیں رکھتے کہ خود ہی خلافت و ملوکیت میں یہ تحریر کر رہے ہیں کہ حضرت علیؓ نے بلوائیوں کے ہر اس اعتراض کا جواب دیا جو وہ حضرت عثمانؓ کے خلاف اٹھا رہے تھے۔ مودودی صاحب کے الفاظ ہیں " حضرت علیؓ نے ان کے ایک ایک الزام کا جواب دے کر حضرت عثمانؓ کی پوزیشن صاف کی" ——— اگر بات یہی ہے تو پھر مودودی صاحب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ حضور والا آیا حضرت علیؓ نے اخلاص کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی وکالت فرمائی تھی یا محض ہمارے کسی وکیل کی طرح کیس جیتنے کے لئے جھوٹ سچ ملا دیا تھا۔ حضرت علیؓ کی شان میں ہم تو یہ گستاخی نہیں کر سکتے۔ پھر اگر جو کچھ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا وہ صحیح تھا اور انہوں نے حضرت عثمانؓ کی پوزیشن صاف کر دی تھی تو پھر مودودی صاحب کون ہوتے ہیں کہ خود کو حضرت علیؓ سے برتر احوال شناس جانیں اور حضرت عثمانؓ کے محاسب بن بیٹھیں ؟

مولانا عبداللہ صاحب نے اس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ خلافت و ملوکیت کی تدوین میں مودودی صاحب نے بعض منفی حوالوں کو اُن مثبت حوالوں پر ترجیح دی ہے جو اصحابؓ کی روش سے بیشتر مطابقت رکھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی پسند کے خلاف جو عبارت نظر آئی ہے وہ اقتباس میں سے حذف بھی کر دی ہے۔

بہرحال زیر نظر تصنیف خاص مفید کتاب ہے اور اہل السنت والجماعت کے عقیدے کی بطریق احسن ترجمانی کرتی ہے ——— اے کاش ایسی مخلصانہ کاوشوں اور " نرم و نازک کلام" کا مودودی صاحب جیسے " مرد دانا" پر کوئی اثر ہو سکتا۔ (ادارہ)

تاریخ تصوف اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

طاؤس الفقراء ابو نصر سرّاج رح

(م ۳۷۸ھ)

صاحب کتاب اللمع

سوانح حیات سرّاج کی زندگی کے حالات بہت کم دستیاب ہو سکتے ہیں۔ صوفیہ کے قدیم ترین تذکرہ نگاروں نے اپنی تصانیف میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے، مثلاً ابو عبدالرحمن السلمی نے اپنی تصنیف "طبقات الصوفیہ" میں ان کا تذکرہ درج نہیں کیا تاہم اس کمی کو انہوں نے اپنی دوسری تالیف "تاریخ الصوفیہ" میں پورا کر دیا ہے۔ "تذکرۃ الاولیاء" میں پہلی مرتبہ ان کا ذکر ملتا ہے۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر جامی رح نے "نفحات الانس" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ ذہبی نے "تاریخ الاسلام" میں، ابوالفلاح عبدالحی نے "شذرات الذہب" میں اور دارا شکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" میں ذکر کیا ہے۔ ذہبی نے صرف اس قدر لکھا ہے "عبداللہ بن علی بن محمد بن یحییٰ ابو نصر السرّاج الطوسی مصنف کتاب اللمع نے جعفر الخلدی، ابو بکر محمد بن داؤد الدقی اور احمد بن محمد السائح سے علم تصوّف حاصل کیا"۔ سُلمی نے یہ لکھا ہے کہ "ابو نصر سرّاج زاہدوں کی اولاد میں سے تھے اور اپنے وطن میں فتوّت کے لحاظ سے مقبول تھے، لسان القوم تھے اور علوم شریعت میں ماہر تھے اور اپنے زمانے میں مشائخ صوفیہ کے فقیہہ تھے"۔

ابو نصر عبداللہ بن علی بن محمد بن یحییٰ السرّاج، طوس کے باشندے تھے۔ انہوں نے جعفر الخلدی، ابو بکر محمد بن داؤد الدقی اور احمد بن محمد السائح[1] سے تصوف کا علم حاصل کیا۔ ان کا خاندان زہد کے لئے مشہور تھا۔ ابو نصر بہت راسخ العقیدہ سنّی تھے۔ انہوں نے شرعی علوم کو اپنی تصنیف کی بنیاد بنایا، شریعت کے علاوہ وہ طریقت کے بھی ماہر تھے اور طبقۂ صوفیہ میں علم تصوّف کے مستند شارح تسلیم کئے جاتے تھے۔ اور

---

[1] السائح کتابت کی غلطی ہے۔ دراصل یہ لفظ "السالمی" ہے اور اس سے ابوالحسن احمد بن محمد بن سالم مراد ہے۔ یہ بزرگ سرّاج کے اساتذہ میں سے تھے۔

اپنے ہم وطنوں میں فتوّت (ایثار اور شرافتِ نفس) کے لئے مشہور تھے۔ رجب ۳۷۸ھ میں وفات پائی۔

فارسی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کا لقب "طاؤس الفقراء" تھا۔ کتاب اللمع کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دنیائے اسلام کے اکثر بڑے شہروں کا سفر کیا تھا اور وہاں کے صوفیوں سے تبادلۂ خیال بھی کیا تھا۔ ان شہروں میں بصرہ، بغداد، دمشق، رملہ، انطاکیہ، تائرہ، اطرابلوس، رحبت مالک بن طوق، قاہرہ، دمیاط، بسطام، تُستر اور تبریز خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے بہت کم لوگوں کو اپنا مرید بنایا۔ ان کے مریدوں میں سے صرف ایک مرید کو شہرت حاصل ہوئی جن کا نام ابوالفضل بن الحسن سرخسی تھا جو ابوسعید ابن ابی الخیرؒ کے شیخِ طریقت تھے۔

سراج نے کتاب اللمع میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب ایک دوست کی التجا پہ لکھی ہے (جس کا نام انہوں نے ظاہر نہیں کیا) اور میرا مقصد یہ ہے کہ تصوف کے صحیح اصول و قواعد کی وضاحت کر دوں اور یہ ثابت کر دوں کہ یہ اصول کتاب و سنّت سے مطابقت تامّہ رکھتے ہیں اور اتباع رسولؐ و صحابہ رضا ان کی غایت ہے۔ (ماخوذ از دیباچہ کتاب اللمع از پروفیسر نکلسن)

(ا) شیخ فریدالدین عطارؒ نے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ "شیخِ وقت ابونصر سراج کے محاسن حدِّ بیان سے فزوں تر ہیں۔ فنونِ علم میں کامل تھے۔ ریاضت اور معاملات میں شان عظیم رکھتے تھے۔ حال و قال اور تشریح حکمات مشائخ میں آیت تھے۔

ان کا قول ہے کہ عشق وہ آگ ہے جس سے عاشقوں کے قلوب مشتعل ہو جاتے ہیں اور "ما دون اللّٰہ" جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ نیز فرمایا "نیت خدا کے ساتھ ہوتی ہے، خدا سے ہوتی ہے اور خدا کے لئے ہوتی ہے۔ نماز میں جو آفت بھی نمازی پر وارد ہوتی ہے اس کا سبب خرابیٔ نیت ہی ہوتا ہے۔"

نیز فرمایا "ادب کے اعتبار سے آدمیوں کی تین قسمیں ہیں (۱) اہلِ دنیا جن کے نزدیک ادب سے مراد فصاحت و بلاغت، حفظ علم و رسم و اسمائے ملوک و اشعار عرب ہے (اسے عرف عام میں ادبیت کہتے ہیں) (۲) اہلِ دین جن کے نزدیک ادب، تادیب جوارح و حفظِ حدود شرعیہ و ترکِ شہوات و ریاضتِ نفس کا نام ہے (۳) اہلِ خصوص جن کے نزدیک ادب، طہارتِ دل، مراعاتِ سرّ، وفاءِ عہد، نگہداشت وقت، نانکوکاری، وقت حضور اور مقامِ قرب سے عبارت ہے۔"

(ب) شیخ علی ہجویری رح نے کشف المحجوب میں دو جگہ ان کا ذکر کیا ہے (۱) ایک جگہ ان کی ایک کرامت کا تذکرہ کیا ہے دوسری جگہ ادب کے لحاظ سے آدمیوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا ہے۔

(ج) جامیؒ نے نفحات الانس میں کشف المحجوب اور تذکرۃ الاولیاء کی عبارتوں کو نقل کر دیا ہے۔ اپنی طرف

سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔

(۵) عزالدین محمود کاشانی نے بھی اپنی تالیف "مصباح الہدایہ" میں دو جگہ سراج کا ذکر کیا ہے (۱) ادب کے لحاظ سے انسانوں کی تین قسمیں اور (۲) نیت کی حقیقت اور اہمیت۔

کتاب اللمع کی خصوصیات اس کتاب میں مصنف نے تصوف سے متعلق اپنے مخصوص نظریات اور خیالات پیش نہیں کئے ہیں بلکہ صوفیائے ماسبق کی تعلیمات کی تشریح پر اکتفا کیا ہے۔ انہوں نے بہت سے بزرگوں اور ان کی تصانیف سے استشہاد کیا ہے جس سے ہمیں تصوف کے تدریجی نشو و نما کا صحیح علم حاصل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس گراں مایہ تصنیف میں بہت سے مختلف النوع مسائل پر مستند معلومات جمع کر دی ہیں۔ اگرچہ اسلوب بیان واضح ہے مگر پھر بھی بہت سے مقامات ایسے ہیں جن سے صرف ماہرین فن تصوف لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

ایک تو مصنف کا اسلوب اجمالی ہے دوسرے یہ کہ انہوں نے وسیع الذیل عنوانات پر اکثر متقدمین کی آرا جمع کر دی ہیں اور اسی پر اکتفا کیا ہے اس لئے کتاب اللمع میں ہمیں صوفیانہ خیالات اور عقائد تصوف کا وہ تجزیہ نہیں ملتا جو مثلاً قوت القلوب میں نظر آتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ سراجؒ نے احوال اور مقامات پر انیس فصول لکھی ہیں جو ان کی کتاب کے ۳۲ صفحات میں آگئی ہیں اس کے مقابلے میں ابو طالب مکیؒ نے صرف ایک مقام (توکل) کو پندرہ صفحات میں لکھا ہے۔ تاہم جو شخص بھی کتاب اللمع کو پڑھے گا وہ تصوف کے مبادی اصول اور مقاصد سے بخوبی آگاہ ہو جائے گا۔ اس کتاب کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سراجؒ نے ایک باب اس موضوع پر باندھا ہے کہ قرآن و حدیث سے صوفیا کا طریق استنباط کیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سماع اور وجد پر ابو سعید ابن العربی نے اپنی تصنیف کتاب الوجد میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے سراجؒ نے ان کا اقتباس اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے چونکہ کتاب الوجد دنیا سے ناپید ہو چکی ہے اس لئے ان اقتباسات کی اہمیت واضح ہے۔

امام غزالیؒ نے بھی اپنی احیاء العلوم میں کتاب الوجد سے استفادہ کیا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ سراج نے "آداب" پر بہت شرح و بسط سے لکھا ہے۔ اتنا مواد تصوف کی کسی کتاب میں نہیں مل سکتا چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ سراجؒ نے اپنی تصنیف کو ایسے اشعار سے مزین کیا ہے جو برمحل اور مفید مطلب ہیں۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تمام مصطلحات فن تصوف کی شرح درج کر دی ہے چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شطحیات صوفیہ کے چند نمونے پیش کر کے ان کی مناسب تاویل بھی لکھ دی ہے جو عموماً صوفیہ میں مقبول ہے۔ ساتویں صفت اس کتاب کی یہ ہے کہ سراجؒ نے ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ

کر دیا ہے جو صوفیانہ عقائد کے ضمن میں لوگوں کے دماغوں میں جاگزیں ہو گئی تھیں (اور آج بھی جاگزیں ہیں)
آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ سراجؒ نے لفظ صوفی کو صوف (اون) سے مشتق تسلیم کیا ہے حالانکہ ان کے زمانے میں بہت کم لوگ اس بات کو تسلیم کرتے تھے۔ نویں خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ سراجؒ نے اعلیٰ صوفیانہ واردات و مشاہدات کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور بہت سے صوفیوں کی شطحیات کی تاویل بھی کی ہے مگر اصولی طور پر وہ تصوف کو جنیدؒ کی طرح مقید بالکتاب والسنت تسلیم کرتے ہیں اور اسی لئے انہوں نے ہر باب میں ہر مسئلے میں قرآن اور حدیث سے استشہاد اور استنباط کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کی بھی صراحت کر دی ہے کہ جو بات کتاب اور سنت سے ثابت ہو جائے اُسے ہر صوفی کو بلا چون و چرا قبول کر لینا چاہیئے کیونکہ اسلامی تصوف کا ماخذ صرف قرآن و حدیث ہے۔

اگر ہم سراجؒ کے اصولِ تفسیر و تاویل کو تسلیم کر لیں تو ہمیں اُسے ایک راسخ العقیدہ صوفی تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال درکار ہو تو ان کی پیش کردہ تاویلِ فنا پر غور کر لو۔ فنا کا مفہوم فنائے ذات تو نہیں ہے جیسا بعض صوفیہ نے سمجھ لیا کہ بندہ ذات باری میں ضم ہو کر اپنی انفرادی ہستی (شخصیت) کو فنا کر دیتا ہے۔ بالفاظ دگر قطرہ سمندر میں مل کر سمندر ہو جاتا ہے اور اپنی انفرادیت کو ختم کر دیتا ہے۔ سراجؒ کی رائے میں فنا کا مفہوم یہ ہے کہ جب سالک توحید ایزدی کا کامل عرفان حاصل کر لیتا ہے اور اپنی مرضی اس کی مرضی میں گم کر دیتا ہے تو مقامِ فنا پر فائز ہو جاتا ہے بلکہ بقول سراجؒ "فنا اور اسلامی توحید میں منطقی۔ ہم آہنگی یا مطابقت پائی جاتی ہے"

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ سراج نے اس کتاب میں اُن تمام غیر اسلامی عقائد مثلاً حلول اور اتحاد کی بڑی شدت کے ساتھ تردید کی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں اسمٰعیلیہ، قرامطہ، باطنیہ، زنادقہ اور شیعہ غلاۃ کی سوچی سمجھی ہوئی سازش کی بدولت اسلامی تصوف میں داخل ہو گئے تھے۔[1] اس کے علاوہ سراجؒ نے اس

---

[1] جیسا کہ قبل ازیں واضح کر چکا ہوں اسمٰعیلیہ فرقے کے لوگ حضرت علیؓ کی الوہیت کے قائل تھے یعنی ان کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے علیؓ میں حلول کیا اور بعض کہتے تھے کہ خدا علیؓ کے ساتھ متحد ہو گیا۔ ان لوگوں نے حلول اور اتحاد کے عقیدے عیسائیوں سے مستعار لئے تھے۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ صوفیہ حضرت علیؓ کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ اگر ہم تصوف کا لبادہ اوڑھ لیں یعنی تقیہ کر کے صوفی بن جائیں تو بآسانی ان سادہ لوح اور شخصیت پرست لوگوں کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اسمٰعیلیہ، قرامطہ، باطنیہ اور دوسرے غالی شیعہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بات کی جگہ جگہ تاکید کی ہے کہ تصوّف کا مطلب ترکِ دنیا نہیں ہے بلکہ اتباع شریعت ہے۔ انہوں نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ایک صوفی اور ایک عام مسلمان میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ صوفی مذہب کے باطنی پہلو پر زیادہ اصرار کرتا ہے اور تزکیہ نفس کو ارکانِ شریعت کی بجا آوری پر مقدم رکھتا ہے۔

کتاب اللمع کے ماخذ سراج نے اپنی کتاب کی تالیف میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا ہے :-

(۱) اخبار مکہ مولفہ ازرقی
(۲) کتاب المشاہدات مولفہ عمرو ابن عثمان المکی
(۳) کتاب السنن مولفہ ابو داؤد الجستانی
(۴) آداب الصلوٰۃ مولفہ ابو سعید الخرازؒ
(۵) مولفات ابو تراب النخشبیؒ
(۶) کتاب المناجات مؤلفہ جنید بغدادیؒ
(۷) کتاب الوجد مؤلفہ ابو سعید ابن العربیؒ
(۸) کتاب معرفۃ المعارفات مؤلفہ ابراہیم الخواصؒ
(۹) شرح شطحیات ابو یزید بسطامیؒ مولفہ جنید بغدادیؒ

فہرست مضامین کتاب اللمع

(۱) مقدمۃ الکتاب۔ اس میں ۱۸ ابواب ہیں ۔

(بقیہ حاشیہ) فرقوں نے جو الوہیت علیؓ کے معتقد تھے صوفی بن کر مسلمانوں میں حلول اور اتحاد کے عقیدوں کے ساتھ ساتھ الوہیت علیؓ کا عقیدہ بھی شائع کر دیا اور چونکہ جو ہستی غالی شیعوں کا معبود تھی وہی ہستی سادہ لوح سنّی صوفیہ کی روحانی پیشوا تھی اس لئے ہزاروں صوفی باطنیہ اور قرامطہ کے دامِ ہمرنگ۔ زمین میں گرفتار ہوگئے اور "خسر الدنیا والآخرۃ" کا مصداق بن گئے۔ قرامطہ اور باطنیہ نے "شیخ طریقت" بن کر حضرت علی رضؓ کے بارے میں جو غیر اسلامی عقائد تلقین کئے عوام نے اس عقیدت کی بنا پر جو انہیں پہلے ہی سے حضرت موصوف کے ساتھ تھی آنکھ بند کرکے بلا سوچے سمجھے قبول کر لئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ جاہل صوفیہ نے حضرت موصوف کو خدا کا ہم پلّہ بنا دیا چنانچہ آج بھی عامۃ المسلمین مصیبت کے وقت علیؓ ہی کو پکارتے ہیں۔ نہ خدا یاد آتا ہے نہ رسولؐ ۱۲

ابواب ۱ تا ۹ اسلام سے تصوف کا رشتہ اور رابطہ۔ محدثین، فقہا اور صوفیہ۔ خصائص صوفیہ۔ صوفیہ کی تعلیمات قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہیں۔

ابواب ۹ اور ۱۰ لفظ صوفی کی تحقیق اور وجہ تسمیہ

ابواب ۱۲ تا ۱۴ تصوف اسلام کے باطنی پہلو کا نام ہے۔ تصوف کی ماہیت اس کا مفہوم اور ماخذ۔

ابواب ۱۵ تا ۱۸ توحید اور معرفت

(۲) **کتاب الاحوال والمقامات** اس میں ۱۹ ابواب ہیں۔

ابواب ۱۹ تا ۳۷ ان ابواب میں احوال اور مقامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

(۳) کتاب اہل الصفوۃ فی الفہم والاتباع لکتاب اللہ عزّ وجلّ۔ اس میں ۹ ابواب ہیں۔

ابواب ۳۸ تا ۴۶ قرآن کے باطنی (مخفی) معانی اور صوفیہ کا طریقہ تاویل و تفسیر

(۴) کتاب الاسوۃ والاقتداء برسول اللہ صلعم۔ اس میں ۴ ابواب ہیں۔

ابواب ۴۷ تا ۵۰ آنحضرت صلعم کی تقلید و اتباع۔ آنحضرت صلعم کی سیرت مبارکہ اور حسن سیرت۔

(۵) کتاب المستنبطات۔ اس میں ۵ ابواب ہیں۔

ابواب ۵۱ تا ۵۵ صوفیہ کا طریق تاویل و تفسیر قرآن و حدیث مع امثلہ

(۶) کتاب الصحابۃ رضوان اللہ علیہم۔ اس میں ۷ ابواب ہیں۔

ابواب ۵۶ تا ۶۲۔ صحابہ کرام رضؓ بھی صوفیہ کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں۔ حضرات صدیق اکبر رضؓ، فاروق اعظم رضؓ، عثمان غنی رضؓ، علیؓ اور اہل الصفہ کے حالات۔

(۷) کتاب آداب المتصوفۃ۔ اس میں ۲۵ ابواب ہیں۔

ابواب ۶۳ تا ۸۸ صوفیہ کے آداب۔ وضو کے آداب، نماز کے آداب، صدقات و زکوٰۃ کے آداب، روزے کے آداب، حج کے آداب، مجلس کے آداب، صوفیانہ گفتگو کے آداب، کھانے پینے کے آداب، ضیافت کے آداب، وجد و حال کے آداب، لباس کے آداب، سفر کے آداب، سوال کے آداب، کسب معاش کے آداب، نکاح کے آداب، خلوت کے آداب، گرسنگی و تشنگی کے آداب، مرض کے آداب، مرشد اور مرید کے آداب، زہاد کے آداب، دوستی کے آداب، وقت وفات کے آداب،

(۸) کتاب المسائل و اختلاف اقاویلھم فی الاجوبہ

اس میں صرف ایک باب ہے۔ عقائد تصوف کے بارے میں بنیادی مسائل کے مختلف جوابات جو مختلف صوفیہ نے دیئے ہیں۔

(۹) کتاب المکاتبات والصدور والاشعار والدعوات والرسائل

اس میں پانچ ابواب ہیں۔ ابواب ۹۰ تا ۹۴

باب ۹۰ صوفیہ کی مراسلت باہمی باب ۹۱ صدور الکتب والرسائل

باب ۹۲ اشعار فی معانی احوالہم و اشارا تہم

باب ۹۳ صوفیہ کی دعائیں اور مناجاتیں

باب ۹۴ توصیۃ باہمی (وصایا جو ایک نے دوسرے کو کیں)

(۱۰) کتاب السماع۔ اس میں ۱۳ ابواب ہیں۔ باب ۹۵ تا ۱۰۹

(۱۱) کتاب الوجد۔ اس میں ۶ ابواب ہیں۔ باب ۹۶ تا باب ۱۰۲

(۱۲) کتاب اثبات الآیات والکرامات۔ اس میں ۶ ابواب ہیں ۱۰۳ تا ۱۰۸

(۱۳) کتاب البیان عن المشکلات۔ اس میں ۱۲ ابواب ہیں ۱۰۹ تا ۱۲۰

ان ابواب میں مصطلحات صوفیہ کی شرح کی گئی ہے۔

(۱۴) کتاب تفسیر الشطحیات والکلمات التی ظاہرہا مستشنع و باطنہا صحیح مستقیم

اس میں ۱۲ ابواب ہیں از ۱۲۱ تا ۱۳۲ ان میں شطحیات کی تشریح کی گئی ہے۔

(۱۵) آخری کتاب میں ۲۰ ابواب ہیں از ۱۳۳ تا ۱۵۲

ان میں غلط عقائد و افکار و نظریات کی تفصیل ہے جو بعض صوفیہ میں راہ پا گئے۔ (جاری)

ہم سے طلب فرمائیں

علامہ محمود احمد عباسی کی تازہ تصنیف

وقائع زندگانی امّ ہانی رضؓ

جس میں پیروان ابن سبا کی بہت سی غلط روایتوں کا پول کھولا گیا ہے

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۹۲، قیمت تین روپے

دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ۔ لاہور

بریدِ ہند

مکتوب مولانا محمد منظور نعمانی

مدیر "الفرقان" لکھنؤ

"عزیز مکرم زید مجدکم سلام و رحمت

خدا کرے مزاج بعافیت ہو۔ مولانا کا مزاج گرامی بھی بخیر ہو۔

جون جولائی کے مشترکہ شمارہ کے تفسیر کے صفحات موصول ہوگئے ہیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ یہ شمارہ بھی آپ کو مشترکہ شائع کرنا پڑا۔ کئی مہینوں سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آپ کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی ہے یا کچھ اور مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے رسالہ ماہ بہ ماہ شائع نہیں ہو سک رہا اللہ تعالیٰ اپنا خاص الخاص فضل فرمائے۔

"الفرقان" یہاں سے وہاں کے خریداروں کو برابر جا رہا ہے اور خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ استثنائے شاذ پہنچ بھی رہا ہے۔ خدا کرے آپ کی خدمت میں بھی پہنچ رہا ہو وہاں کی کوئی چیز نہ آ سکنے کی وجہ سے بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

خط لکھا جا چکا تھا، ابھی حوالۂ ڈاک نہیں ہوا تھا کہ تازہ شمارہ بابت جون و جولائی کے تذکرہ و تبصرہ کے صفحات بھی موصول ہوگئے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ میں اس وقت وہی پڑھ رہا ہوں تفسیری صفحات جب جب دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے برابر یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا سے اللہ تعالیٰ بڑا عظیم کام لے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ زندگی اور صحت و توانائی میں برکت فرمائے اور اس کام کو اسی معیار سے پورا کرا دے ——— مولانا کی خدمت میں میرا مخلصانہ سلام نیاز پہنچا دیجئے۔ دعا کرتا ہوں اور دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی

لکھنؤ ۲۰ر جولائی ۱۹۷۰ء

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۲

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

ڈاکٹر اسرار احمد
ایم بی بی ایس - ایم اے (اسلامیات)

یہ رسالہ، جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ نے ان حقوق و فرائض کی تشریح کے مقصد سے لکھا ہے جو ایک مسلمان پر قرآن سے متعلق عاید ہوتے ہیں - اس زمانے میں قرآن پر ایمان کے مدعیوں کی کمی نہیں ہے - لیکن یہ بہت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ایمان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں - ڈاکٹر صاحب سلمہ نے قرآن کے دلائل کی روشنی میں ان تقاضوں اور مطالبوں کی تشریح کی ہے اور بیک نظر محسوس ہوتا ہے کہ نہایت خوبی اور نہایت جامعیت کے ساتھ تشریح کی ہے - انداز بیان نہایت دلنشین، دلائل نہایت محکم اور اسلوب خطاب نہایت ہی موثر اور درد مندانہ ہے - ہر مسلمان جو قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے، اس رسالے میں بہترین رہنمائی پائے گا - اللہ تعالی ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں - ہماری بہت سی عزیز امیدیں ان سے وابستہ ہیں - (مولانا امین احسن اصلاحی)

سائز ۱۸ × ۲۲/۸ ، صفحات ۷۲ - طباعت آفسٹ ، خوشنما کور
قیمت فی نسخہ : ایک روپیہ

-: شائع کردہ :-

دار الاشاعۃ الاسلامیہ لاہور

کوثر روڈ - اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور-1 (فون 69522)

Monthly MEESAAQ Lahore
Vol. 17 | AUGUST 1970 | No. 8

سلسلہ مطبوعات قرآن اکیڈمی نمبر ۳

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ

تاکہ حق کو حق ثابت کردے اور باطل کو باطل (سورۂ انفال)

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار

ہمارے تحقیقِ اسلامی کے اداروں کے سامنے کرنے کا اصل کام

تالیف

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ایم اے، پی ایچ ڈی ۔ ڈی لٹ

"......... محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے اس مقالے سے میرے دل کو سب سے زیادہ اطمینان حاصل ہوا ہے۔ میرے نزدیک اسلامی ریسرچ کا صحیح تصور یہی ہے جو اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے ...."

مولانا امین احسن اصلاحی

"........ اس موضوع پر میری نظر سے اس سے زیادہ تشفی بخش تحریر اب تک نہیں گزری .... اسلامی موضاعات پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتابچہ ایک دستور العمل کا درجہ رکھتا ہے........"

ڈاکٹر سید عبداللہ، سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

قیمت قسم اعلیٰ : ڈیڑھ روپیہ ،قسم ادنیٰ ایک روپیہ (محصول ڈاک اس کے علاوہ)

—: شائع کردہ :—

دار الاشاعة الاسلامیہ لاہور

کوثر روڈ ۔ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۔ 1 (فون 69522)